المنار

سالنامہ ۱۹۶۳ء

علم و عمل

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (القرآن) ۔

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

علم و عمل

سرپرست :- صاحبزادہ مرزا ناصر احمدؒ صاحب۔ پرنسپل

نگران :- چودھری محمد شریف خالد

مدیر اعلیٰ :- رشید احمدؒ جاوید

مدیران :- عطاء المجیب راشد

عابد ربانی

جلد ۱۳ — اپریل، مئی، جون ۱۹۶۳ء — شمارہ ۳

پرنٹر و پبلشر :- حمید ہاشمی - مطبع :- ضیاء الاسلام پریس - سرورق :- نصرت آرٹ پریس

ربوہ

جھلک

(۱) تبرکات

تیرے ہاتھوں سے مرے پیارے اگر کچھ ہو تو ہو۔	حضرت بانیٔ سلسلۂ احمدیہ	ص۷
دہریہ مذہب کی تردید	" " "	ص۹

(۲) اداریہ

	ادارۂ تحریر	ص۱

(۳) فکر و نظر

اسلام دینِ فطرت ہے۔	پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب	ص۱۴
ادب اور بنیادی انسانی اقدار	جیلانی کامران	ص۳۴
رسولِ کریمؐ کی پاکیزہ زندگی۔	احمد جواد۔ بی۔ اے (فائنل)	ص۵۴
الرفیق الاعلیٰ	اقبال نجم۔ بی۔ اے (سالِ اوّل)	ص۳۸
محبت و عقیدت کے چند پھول	محمود مجیب اصغر (اولڈ بوائے)	ص۴۷
رحمۃ للعالمین۔ دشمنوں سے حسنِ سلوک	محمد داؤد طاہر۔ بارھویں کلاس	ص۱۹
رِستے ناسور	محمود احمد ونیس۔ بی۔ ایس سی (سالِ اوّل)	ص۳۱
انسانی تخیل کی سحرکاریاں	انعام قریشی بی۔ اے (سالِ اوّل)	ص۵۷
علم کا غلط استعمال	عابد علی عابد۔ ایف۔ ایس سی (فائنل)	ص۴۹
مطالعۂ قدرت	ممتاز احمد۔ بارھویں کلاس	ص۱۷
آزادیٔ وطن کے لئے مسلمانوں کی جدوجہد	واجد حبیب۔ گیارھویں کلاس	ص۲۵
تعمیرِ قوم میں اخلاق کا مقام	کرشن احمد۔ گیارھویں جماعت	ص۵۰
امتیازی نشان	عبد الستار یزدانی۔ گیارھویں کلاس	ص۶۴
بے عمل میں زندگی	ہدایت ہادی۔ گیارھویں جماعت	ص۵۳

(۴) نقشِ حیات

فداکار	عطاء المجیب راشد بی۔ اے (فائنل)	ص۸۹
تاثیرِ عمل	رشید جاوید	ص۱۰۲
سپنوں کی راکھ	ایم۔ جے۔ حزین۔ بی۔ ایس سی (تھرڈ ایر)	ص۸۱
حقِ دوستی	مجیب الدین امجد بی۔ اے (سالِ اوّل)	ص۶۹
سنہرا موڑ	اظہر سلیم۔ گیارھویں کلاس	ص۶۱

آہ غریب کم نہیں ظلم شہ جہاں سے کچھ	محمد یوسف بلوچ۔ ایف ایس سی (سال دوم)	ص ۶۷
پیکرِ عزم	ناصر طاہر۔ بارھویں جماعت	ص ۶۴
صدمے! سہارے!!	محشر : بارھویں جماعت	ص ۷۲
دولت	انتصار احمد جہار۔ بارھویں جماعت	ص ۹۷
نورِ نظر	عابد ربانی۔ گیارھویں جماعت	ص ۷۵
نورِ ایمان	اسلم بھٹی۔ ایف۔ ایس سی (سال اول)	ص ۸۶
ایک سرد رات	طاہر جاوید۔ ایف۔ ایس سی (سال اول)	ص ۶۳

⑤ اپنی باتیں

کالج کے شب و روز	ارشد ترمذی	ص ۱۱۱
ہمارے سالانہ مباحثے	ش بدخیال	ص ۱۱۳
چند جانے والے	ابوالعفراق	ص ۱۱۷

⑥ نامہ و پیام

لال خاں، حامد نصراللہ خان، نذیر احمد خادم، رشید الدین انور۔ حفیظ اظہر ص ۱۱۹

⑦ لطافتِ طنز، رنگِ مزاح

ضرورت ہے۔	ل۔ م	ص ۱۳۱
نوشی و خوری	غلام رسول آشنا بی۔ اے (فائنل)	ص ۱۳۵
یونائٹڈ فرنٹ آف فلائز	رشید جاوید	ص ۱۳۷
ہماری پہلی تقریر ـــ سوانح حیات	احمد جواد بی۔ اے (فائنل)	ص ۱۳۹
دعوت	سعید انجم بارھویں کلاس	ص ۱۴۱

⑧ افکارِ عالیہ

علم و عمل	حضرت سید حامد شاہ صاحبؒ	ص ۱۴۲
تیرے میخانے کی خیر	حضرت قاضی اکمل صاحب	ص ۱۴۳

⑨ شبستانِ غزل

ص ۱۴۴-۱۵۲

شیخ روشن دین تنویر ـ پروفیسر محمد شریف خاکی ـ ارشد ترمذی ـ مصلح الدین راجیکی
فیصل احمد اسلم ـ لطف الرحمٰن محمود ، خلیق اختر ـ عابد ربانی ـ رضا گیلانی ـ ناصر احمد

ـــ ؤ ـــ

تبرکات

تیرے ہاتھوں سے مرے پیارے اگر کچھ ہو تو ہو!

اے خدا اے کارساز و عیب پوش و کردگار!
اے مرے پیارے میرے محسن میرے پروردگار!

کچھ خبر لے تیرے کوچہ میں یہ کس کا شور ہے
فضل کے ہاتھوں سے اب اس وقت کر میری مدد
میرے سقم و عیب سے اب کیجئے قطعِ نظر
میرے زخموں پر لگا مرہم کہ میں رنجور ہوں
دیکھ سکتا ہی نہیں میں ضعفِ دینِ مصطفےٰؐ
کیا سلائے گا مجھے تو خاک میں قبل از مراد
یا الٰہی فضل کر اسلام پر اور خود بچا

خاک میں ہوگا یہ سر گر تو نہ آیا بن کے یار
کشتیٔ اسلام تا ہو جائے اس طوفاں سے پار
تا نہ خوش ہو دشمنِ دیں جس پہ ہے لعنت کی مار
میری فریادوں کو سُن میں ہو گیا زار و نزار
مجھ کو کر اے میرے سلطاں کامیاب و کامگار
یہ تو تیرے پر نہیں امید اے میرے حصار
اس شکستہ ناؤ کے بندوں کی اب سُن لے پکار

قوم میں فسق و فجور اور معصیت کا زور ہے
چھا رہا ہے ابرِ یاس اور رات ہے تاریک و تار

ایک عالم مر گیا ہے تیرے پانی کے بغیر
اب نہیں ہیں ہوش اپنے ان مصائب میں بجا
کس طرح نپٹیں کوئی تدبیر کچھ بنتی نہیں
ڈوبنے کو ہے یہ کشتی آ مرے اے ناخدا
نورِ دل جاتا رہا اور عقل موٹی ہو گئی
اے خدا میں تیرے ہو یہ آبپاشی کس طرح
تیرے ہاتھوں سے مرے پیارے اگر کچھ ہو تو ہو

پھیر دے اب میرے مولیٰ اس طرف دریا کی دھار
رحم کر بندوں پہ اپنے تا وہ ہوویں رستگار
بے طرح پھیلی ہیں یہ آفات ہر سُو ہر کنار
آ گیا اس قوم پر وقتِ خزاں اندر بہار
اپنی کجرائی پہ ہر دل کر رہا ہے اعتبار
جل گیا ہے باغِ تقویٰ دیں کی ہے اب اک مزار
ورنہ فتنہ کا قدم بڑھتا ہے ہر دم سیل وار

اے خدا کمزور ہیں ہم اپنے ہاتھوں سے اٹھا
ناتواں ہم ہیں ہمارا خود اٹھا لے سارا بار

اداریہ

کفرانِ نعمت

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن تاریخِ اسلام میں ایک یادگار دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس روز دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت "پاکستان" معرضِ وجود میں آئی۔ مسلمانانِ ہندوستان کو صدیوں پرانا طوقِ غلامی اتار پھینکنے کی توفیق ملی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خلعتِ آزادی کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ خطۂ ارض پر اس عظیم الشان حقیقت کی ظہور پذیری کے لئے ہم نے کتنی قربانیاں دیں۔ کتنی معصوم محبتوں کے جوش ٹھنڈے ہوئے۔ کتنی عزتوں کو خاک و خون کی دلدلوں میں پامال ہوتے دیکھا۔ کتنے جور و ستم کا مقابلہ کیا۔ کتنے طوفانوں کے آگے سینہ سپر ہوئے۔ یہ ایک طویل دردناک داستان ہے۔ افقِ حریت پر اس نقش کو ابھرے سولہ برس کا لمبا عرصہ گذر چکا ہے۔ بچے جوان ہو گئے۔ جوان بوڑھے ہو گئے اور بہت سی قیمتی جانیں بہارِ وطن کی جولانیاں دیکھنے سے پہلے ہی نہ معلوم کتنی ہی حسین و جمیل امیدوں اور آرزوؤں کو اپنے استادہ دامن میں لپیٹ کر اس دنیائے بے ثبات سے عالمِ دوام کو سدھار گئیں۔ مگر آہ اتنی مدت گذر جانے کے بعد بھی وطنِ عزیز کی خزاں اپنے خاتمہ کو نہ پہنچی، اور یہ بچہ اپنی مادرِ مہرباں — اپنی قوم کی چھاتیوں کو دیکھ دیکھ کر بلکتا رہا۔ پر ان چھاتیوں سے استقلال اور قربانی و ایثار کی غذاؤں سے سیراب کیا ہوا دودھ نہ اترا۔ آج وہ بچہ، جس کی تمنائے بلوغت ہنوز تشنۂ تکمیل ہے پھر سے پہلے سے زیادہ جوش، زیادہ درد اور زیادہ ولولہ سے اپنی قوم کی خوابیدہ قوتوں کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ ذرا اس کی آواز کو سنو۔

"اے مادرِ مہرباں! تو نے مجھے جنم دیا۔ اس عالمِ رنگ و بو میں لانے کا باعث ہوئی۔ ظاہر ہے تو میری پرورش کی مکلف تھی، میری نشو و نما کی موافقت اور بلندیوں اور رفعتوں پہ میری پرواز کی ذمہ داری میری حفاظت تجھ پہ مستلزم تھی۔ اور میرے ننگ و ناموس کی حراست و نگہبانی تیرے سر پہ فرض — مگر اے مادرِ مہرباں تو اپنی ان ذمہ داریوں سے کس حد تک عہدہ برآ ہوئی۔ تو نے اپنے وعدہ ہائے محبت کو کس حد تک نبھایا — ؟ اے مادرِ مہرباں! ان سوالوں کے جواب میرے رنجور بدن کی لسانِ باوفا اور زبانِ درد زا سے سن! شاید میرے سوز و ساز کو سن کر تیرے قلبِ سنگ پارہ سے رحم و کرم کا کوئی چشمہ پھوٹ آئے۔ تو میں تیرے سامنے ان فضاؤں کا تذکرہ چھیڑ دوں۔ جن فضاؤں تلے تو نے میری تربیت کا انتظام کیا — ہاں تیری مذہبی، علمی، ثقافتی، سماجی و معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی فضاؤں کا تذکرہ! بیانِ حال!!

"وہ مسلمان جس نے مجھے اسلام کے نام پر اس لئے حاصل کیا، کہ آپ میرے ذریعہ مذہبی امن وسلامتی میسّر آئے گی۔ کیا وہ اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو گیا؟ نہیں مادرِ مہرباں!! اس مسلمان نے میری رگوں کا خون چوسنے کے لئے، میرے ہر گوشہ میں، میرے ہر کونہ میں مذہبی منافرت اور تنگ دلی کے فتنے کھڑے کر رکھے ہیں ـــــ اس نے میرے ریشہ ریشہ میں نفاق، بدامنی، فتنہ پردازی اور خوں ریزی کے زہر ہلاہل میں بجھے ہوئے تیز نوک نیزے گاڑ رکھے ہیں۔ وہ مسلمان میرے محبوب بانی حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کا "اتحاد، تنظیم اور اعتماد" کا سنہری گر اپنے ذہنوں سے حرفِ غلط کی طرح محو کر چکے ہیں۔ وہ دین جو دنیا کے مذہب میں رواداری کا سب سے بڑا علمبردار ہے آج اسی دین کے نام لیوا، اسی دین کے نام پر، باہم جبر و اکراہ اور ظلم و تشدد کے وہ پہاڑ توڑ رہے ہیں کہ الامان والحفیظ! ـــــ اے مادرِ مہرباں! میرے ساتھ یہ ناقابلِ برداشت سلوک وہ ہاتھ کر رہے ہیں جنہوں نے مجھے اسلام کے نام پر حاصل کیا۔

"وہ نوجوان جو ملک کی ترقی و استحکام کے ستون ہوتے ہیں ان کا طرزِ عمل بھی کچھ کم حیا نگاہ نہیں ہیں۔ تعلیمی اداروں میں ان کے آئے روز کے کارنامے میرے روشن مستقبل پر نہایت کاری ضربوں کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ طالب علم جو جبت استادوں کی اطاعت کی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ کل میرا بار گراں کیسے اٹھا سکتے ہیں۔ جو مطیع ہو کر اطاعت کا سبق نہیں سیکھتے وہ اولوالامر ہو کر قومی ذمہ داریوں کے بوجھ کو کیونکر برداشت کر سکیں گے۔ وہ طالب علم جو ہڑتالوں اور مظاہروں کی قیادت پر فخر کرتے تھے کل عنانِ حکومت سنبھال کر کیا خدمت انجام دیں گے۔ میرا روشن مستقبل ان طالب علموں کا رہینِ منت ہوگا جنہوں نے اپنے فرائض عزم، ہمت اور جوانمردی و استقلال سے انجام دیئے۔ وہ بزدل جو ہڑتالوں اور مظاہروں پر قانع ہو گئے وہ میرے انصرام کی قدرت سے محروم ہیں۔ میں ان ہڑتال نژاد بزدلوں سے پوچھتا ہوں کہ کل جب دشمن تم پہ تشدد ڈھائے گا۔ تمہاری قوت سے زیادہ تم پہ بوجھ ڈالے گا۔ اس وقت کن ہڑتالوں اور مظاہروں کا سہارا لو گے؟ کیا بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جاؤ گے؟ خوب! پھر تو تم نے میری حفاظت کے عہد کو خوب نبھایا۔ــ مادرِ مہرباں! میری مشفق قوم!! میری پیاری ملت!!! اپنے ہونہاروں کو تعمیری ڈگر پر چلا، جادۂ مستقیم پہ ڈال۔

"اور مادرِ مہرباں! یہ ثقافت کے نام پر جو ڈھول بجائے جا رہے ہیں۔ انھیں بھی سُن۔ یہ رقص و سرود کی محفلیں، یہ اٹھتی جوانیوں کے بے محابا کرتب، یہ آرکسٹرا کی دھنیں اور بین باجوں کی سُریں بھی دیکھتی سنتی جا۔ اور پھر دل پہ ہاتھ رکھ کر سُن۔ ثقافت کا یہ ناپاک کھیل اسلام کے نام پر کھیلا جا رہا ہے! اسلام کے مقدس نام پر!! مادرِ مہرباں!! اپنے نوجوانوں کی قوتِ عملیہ کا اس طرح جنازہ نہ نکال۔ اسے اس طرح سلب نہ کر۔ اپنے ماضی پر نظر ڈال

اگر کل مسلمان یہ قبیح کھیل نہ کھیلتا جسے آج ثقافت کا لبادہ پہنا کر پیش کیا جا رہا ہے تو آج مسلمان ایسا بے بس اور لاچار نظر نہ آتا۔ اور مادرِ مہربان! وہ بچہ جس نے پاکستان کے نام پر جنم لیا۔ تیرے حضور یہ درخواست لے کر حاضر ہوا ہے کہ خدارا ثقافت کا یہ ناپاک ڈرامہ جلد ختم کیا جائے۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ جس طرح مسلمان کے ماضی کے "کل" کا حشر ہوا! وہی مستقبل کے "کل" کا حشر ہوگا۔ وہ راہ جس کا تعین "ثقافت" کے پس پردہ کیا جا رہا ہے۔ وہ راہ یقیناً مسلمان کی راہ نہیں وہ ان قوموں کی راہ ہے جو تنزل اور زوال کی طرف رواں دواں ہوں۔

"اور مادرِ مہربان! تو اپنے سماج اور معاشرہ کی بھی خبر لینی جا۔ یہ چکلے، یہ عزت و ناموس کی سودہ گاہیں یہ اغوا کے واقعات، یہ بڑھتی ہوئی گداگری، یہ بازاریت یہ سوقیانہ اطوار و اخلاق، یہ عزت و ناموس کی رکھوالیوں پہ آوازے، یہ بھنگ چرس، افیون اور شراب کی ٹھیکیداریاں، یہ روز افزوں چوریاں اور ڈاکے یہ رشوت ستانیاں، اور جرائم کی بڑھتی ہوئی تعداد یہ سب کس بات کی غمازی ہے! کس بات کا اظہار ہے!! کس انجام کی طرف اشارہ ہے!!! اے مادرِ مہربان! میری روح کو ان اخلاق سوزیوں سے مخلصی عطا کر۔

"اور ذرا اقتصادی فضا کا جائزہ بھی لیتی جا۔ سرمایہ دار۔ شرابِ دولت کے نشہ میں مخمور دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا سو رہا ہے۔ اے ملکی ضروریات کا کوئی احساس نہیں۔ ملک کی خاطر قربانی کا محاورہ اس نے سُنا ہی نہیں۔ مہنگائی کی راہ غریب عوام کا خون چوس رہا ہے نہ جانے کب اس کا نشہ اُترے گا۔ نہ جانے کب مغربی سرمایہ داریت کے نظریات اس کے ذہن سے مفقود ہوں گے اور نہ جانے کب وہ "اسلامی نظامِ اقتصادیات" کے فوائد سے آگاہ ہوگا۔ اور یہ مزدور بجائے اس کے کہ اسلامی اصولوں پہ چلتے ہوئے سرمایہ کار کو راہِ راست پر لائیں یہ بھی مغربی ہتھکنڈوں کے دلدادہ ہو گئے۔۔۔ گویا یک نہ شد دو شد۔ اور ان "کپوتوں" کی بھی خبر لے۔ یہ سمگلر، بلیک مارکیٹیر اور ذخیرہ اندوز!!! مادرِ مہربان! خوب جان لے کہ یہ معاشی برائیاں دن بدن میرے بازوؤں کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ مجھے ان سے رہائی دے

"اور آخر میں ان سیاسی لوسر بازوں کے کارنامے بھی میری داستانِ درد میں شامل کر لے ان لوگوں نے مجھے سب سے زیادہ اذیت پہنچائی۔ میری رگ رگ ان کے لگائے ہوئے زخموں سے دُکھ رہی ہے گذشتہ سولہ سال سے میری پرواز میں اگر کوئی بڑی روک بنے تو یہی سیاستدان تھے۔ سیاستدان اپنی ذات میں بُرا نہیں لیکن وہ سیاست دان جو خود غرض ہے اور قومی احساس سے بے بہرہ ہے وہ یقیناً اس لائق ہے کہ سوکھی ہوئی شاخ کی طرح شجرِ ملت سے کاٹ دیا جائے کیونکہ وہ باقی شاخوں میں بھی خود غرضی اور نفس پرستی کے جراثیم چھوڑتا ہے۔ ہمارے سیاستدانوں کا امتیازی نشان "بے ضمیری" ہے اگر ان میں دل ہوتا۔ بیدار ضمیر ہوتا تو یہ نوخیز بچہ بہت پہلے یا کم از کم

آج تو ضرور جوانی کی ترنگ سے آشنا ہو چکا ہوتا۔ ہمارے سیاستدانوں کا ایک اور امتیازی نشان "عدیمت گردی" ہے۔ آئے دن وفاداریوں کی تبدیلیاں۔ نظریات کا تضاد، بچوں کی سی باہمی نونک جھونک، نعرے بازی اور باہمی بغض و عناد اسی بے کرداری کے آئینہ دار ہیں صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں کیا ہو رہا ہے۔ فضول نزاع خانی۔ ہنگامے۔ آوازے اور بے نقط بندشوں کی مشق!! یہ اسمبلیاں ہیں یا مسخروں اور بھانڈوں کے اکھاڑے!!! کسی رکن اسمبلی کی عزت محفوظ نہیں بلکہ جان بھی خطرے میں ہے۔ اور مشرقی پاکستان صوبائی اسمبلی کے سپیکر سے جو گذری وہ تو ابھی کل کا واقعہ ہے واللہ! یہ کیا ستم آرائی ہے کیا تمسخر ہے۔ انگریز کی غلامی سے نجات پائی تو نفس کی بدترین غلامی کا ہار گلے میں ڈال لیا۔ مادر مہربان! میری مشفق قوم!! کیا وہ دن بھی آسکتا ہے کہ جب تمام وہ لوگ جو اپنے آپ کو تیری طرف نسبت دیتے ہیں۔ تیری غلامی اور تیری اطاعت کا جوا اپنے کندھوں پر ڈالے رکھیں گے

. . . .

۔۔ اور مادر مہربان! مجھے ایک اور دکھ بھی کھائے جا رہا ہے۔ تیری رفاقت کا دم بھرنے والے اپنے ضابطہ اخلاق کو چھوڑ کر بیگانوں کی درگاہ میں دو زانو بیٹھ گئے ہیں مجھے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا لیکن آج میری سرزمین میں کھلے بندوں اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا ہے اسلامی اصول ہی وہ بہترین غذا ہے۔ اے مادر مہربان! جو تیری چھاتیوں میں ایسا پرتاثیر دودھ پیدا کرے گی کہ جس کے استعمال سے یہ بچہ بہت جلد بڑھیگا اور پھولیگا اور پھلیگا۔ اور پھر کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ غیروں کی نقالی میری زیست کے لئے سم قاتل ہے یہ بھوک ہڑتال اس شخص کی یاد ہے جو وجود پاکستان کا سخت دشمن اور بدخواہ تھا۔ ایک پاکستانی کے لئے اس یاد کو دہرانے سے بہتر تھا کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ حضرت قائد اعظم پر بڑی بڑی مشکلات آئیں اور ان کے سامنے پاکستان ایسے عظیم مطالبہ کو منوانا تھا لیکن انہوں نے تو کبھی بھوک ہڑتال پر انحصار نہ کیا۔ اسلاف مسلمانوں پر تکالیف و مصائب کے پہاڑ گرائے گئے انہوں نے تو اس بدعت پر قدم نہ مارا۔ اور اگر یہ کوئی ایسی قابل تقلید یا قابل تعریف چیز ہوتی تو بانی اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں اس کی جھلک ہوتی۔ حق تو یہ ہے کہ بھوک ہڑتال بانی اسلام کے اسوہ حسنہ سے واضح سرکشی ہے اور آپ کے پیش کردہ ضابطہ اخلاق سے ایک کھلی ہوئی بغاوت!

اے پاکستانی قوم! میری پکار کو غور سے سن! مسلمان میری نگہداشت کے فرائض سے کب تک غافل رہیں گے۔ بہت دیر ہو گئی اور لمبی مدت گذر گئی اب تو اس نوخیز بچہ کی اپیل رحم منظور ہو۔"

وطن عزیز کے تقاضوں کو آپ نے پڑھ لیا ہے ہمیں اپنی بدبختی پر غور کرنا چاہیئے۔ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنا چاہیئے۔ ہم پر جو آفات و مصائب کے بادل چھائے ہوئے ہیں انہیں بے وجہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ خدا تعالے نے

لہ قادیانی شدھی کی ازم کو بھی ذہن میں رکھیں۔

قرآن مجید میں صاف فرماتا ہے "ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الانفال آیت ۵۴ نیز دیکھیں الرعد آیت ۱۲۵) یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی قسمت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اس کی اپنی اندرونی حالت نہ بدل جائے

پس قوم کے لئے لمحۂ فکریہ ہے چاہیئے کہ وہ نعمت آزادی کی قدر کو پہچانے اور ناشکری نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف شاکرین کی مساعی کو ہی نوازتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے "وَاِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم آیت ۸) اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعماء کی قدر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں پہلے سے بھی بڑھ کر انعامات سے سرفراز کرے گا۔

اب ہم اپنے اس نوٹ کا خاتمہ حضرت امام جماعت احمدیہ (اطال اللہ بقاءہ) کے ایک خطاب کے اقتباسات پر کرتے ہیں جن کا تعلق بالخصوص طلبہ کی قومی و ملّی ذمہ داریوں سے ہے۔ ۲ر اپریل ۱۹۵۰ء کو آپ نے تعلیم الاسلام کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"کالج کی تعلیم سے فارغ ہونیوالوں کو میری نصیحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ابدی اور اٹل ضابطہ کو کبھی نہ بھولو۔ سہل انگاری اور تن آسانی کی کبھی خواہش نہ کرو۔ پیہم کوششوں اور سعی میں لگے رہو۔ اور قرآن کے ارشاد کے مطابق ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتے جاؤ۔ دعاؤں کو کبھی نہ بھولو تا اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی نصرت تمہارے شامل حال رہے ...... غور و فکر کو اپنی ذات کی خاطر ہی مخصوص نہ کر لو ...... دیکھو تم ایک نوزائیدہ مملکت کے شہری ہو ...... تم ایک لمبا عرصہ غیر ملکی حکومت کے سایہ تلے رہے اور تم غیر ملکی حفاظت کے عادی ہو گئے ہو۔ اب جبکہ تم آزاد ہو تمہیں ایک نیا ضابطہ اور ایک نیا زاویہ نگاہ وضع کرنا ہو گا۔ تمہیں ایک نئے ماحول نئے حالات اور نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے تمہیں ایک نئے ملک کی ساکھ اور عزت کو دنیا میں قائم کر کے دکھانا ہے ......

تمہاری ذمہ داریاں ایک پرانے ملک میں پیدا شدہ نئی نسل سے زیادہ ہیں ...... تمہیں آنے والی نسلوں کے لئے ایک نمونہ چھوڑنا ہے کیونکہ وہ نسلیں ایک حد تک تمہاری چھوڑی ہوئی بنیادوں پر نئی تعمیریں استوار کرینگی۔ اگر تم نے غلط بنیادیں رکھیں تو ان بنیادوں پر کھڑی کی جانیوالی عمارتیں بھی غلط ہوں گی ...... اگر دیوار کی خشتِ اول ہی سیدھی اور درست نہ لگائی جائے تو وہ دیوار قائم نہیں رہ سکتی۔ ....

...... تم پاکستان کی خشتِ اول ہو پس تمہارے لئے احتیاط لازم ہے۔ تمہارے طریق کار اور تمہارے ہوا وہیں کوئی کمی نہیں رہنی چاہیئے ...... اگر تم ایثار اور محنت کے ساتھ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تو تم آنیوالی نسلوں سے بیش بہا خراجِ تحسین حاصل کر سکتے ہو ...... ہمیشہ آگے بڑھنے کی فکر میں رہو۔ آخری قدم کے متعلق کبھی نہ سوچو کیونکہ قوم کے نوجوان کبھی آرام

نہیں کیا کرتے ...... انکے سفر کا کوئی خاتمہ نہیں ...... انکا پہلا ٹھہراؤ اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے خالق سے ملتے ہیں اور کامیاب خاتمہ پر خراجِ تحسین وصول کرتے ہیں ۔

عزیزو! تم اسلام کے وہ بہادر سپوت ہو ۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے مذہب تمہارے ملک اور تمہاری ملت کے لئے انتخاب کیا سو تم ہمت اور اعتماد کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کرو ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو ۔ آمین ۔" (س ۔ ا ۔ ج)

بلیک آؤٹ

موجودہ دور ترقی یافتہ جنگ کا دور ہے اب جہاں انسانوں نے انسانوں کے خلاف لڑنے کے لئے جدید آلاتِ جنگ ایجاد کرلئے ہیں وہاں دشمن کے حملوں سے بچاؤ کیلئے جدید وسائل بھی دریافت کئے ہیں چنانچہ ہر ترقی یافتہ ملک میں ہوائی حملے سے بچاؤ کے لئے حکومت کی نگرانی میں شہری دفاع کے تربیتی ادارے قائم ہیں ۔ پاکستان بھی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں اور وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں میں شہری دفاع کی مشقیں کروائی جاتی ہیں ۔ یہ مشقیں عموماً بلیک آؤٹ کی صورت میں ہوتی رہتی ہیں ۔ گذشتہ دنوں یہاں دو مرتبہ اس قسم کا بلیک آؤٹ ہو چکا ہے ۔ ہمیں اس طریقہ کار کی افادیت سے انکار نہیں مگر ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ مشقیں امتحان کے قریبی دنوں میں طلبہ کیلئے وقت اور تکلیف کا موجب ہیں ۔ ان بیچاروں کو تو پہلے ہی آئے روز "واپڈا" والے بلیک آؤٹ کی مشقیں کراتے رہتے ہیں ۔ روشنی بند ہونے کی وجہ سے طلبہ کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے ایک قومی فائدہ کے لئے دوسرے قومی فائدہ کی قربانی مناسب معلوم نہیں ہوتی ۔ اس سلسلہ میں ہم حکامِ بالا سے یہ درخواست کرینگے کہ ان مشقوں کیلئے ایسے اوقات رکھے جائیں جس سے طلبہ کی پڑھائی میں خلل واقع نہ ہو سکے ۔ خصوصاً امتحانات کے قریب ان مشقوں کو ملتوی رکھنا چاہیئے ۔ (ا ۔ ت)

مشعلِ راہ

نوجوان قوم کی وہ قیمتی متاع ہیں جن پر اس کی بقاء اور ترقی کا دارومدار ہے نوجوانوں کو جسدِ ملت میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام حاصل ہے اور حضرت امام جماعت احمدیہ کے اس قول کی صداقت و اہمیت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ "قوموں کی اصلاح نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی" کسی قوم کی بقاء اور ترقی کا انحصار یوں تو نوجوانوں پر ہوتا ہی ہے ۔ مگر نوجوانوں میں سے بھی ایک مخصوص طبقہ یعنی طلبہ کا طبقہ قومی و ملی ارتقاء میں زیادہ اہم اور نمایاں کردار ادا کرتا ہے جس ڈگر اور جس نہج پر طلبہ کی تربیت ہوگی اسی طور قوم کا مستقبل ڈھل جائے گا ۔ اسلئے یہ ضروری ہے کہ طلبہ کی تربیت ایسے رنگ میں کی جائے کہ وہ ملک و ملت

کیلئے مفید اور قیمتی وجود ثابت ہوں ان کو ایسا نظام تعلیم دیا جائے جو ان کو قومی ضروریات کا احساس دلاتا رہے اور ان کے اخلاق و اطوار، قوم کی اعلیٰ و ارفع اقدار پر استوار ہو جائیں۔ انگریز کا بخشا ہوا نظام تعلیم ہمارے جواں سال طبقہ میں زہر کی طرح سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اور ہمارے طالبعلم اپنے روایاتی اعلیٰ اسلامی اخلاق و عادات کو بھول کر مغربیت کے سانچے میں ڈھلتے جا رہے تھے۔ ایسے نازک وقت میں حضرت امام جماعت احمدیہ نے محسوس کیا کہ ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جو مغربیت کے اس زہر کیلئے تریاق کا حکم رکھتی ہو۔ چنانچہ آپ نے خالصتاً اسلامی بنیادوں پر تعلیم الاسلام کالج کی اساس رکھی۔ اس طرح سے ایک ایسی درسگاہ کا قیام عمل میں آیا جہاں جدید علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تدریس کو لازمی قرار دیدیا گیا۔ اس طرح علوم جدیدہ اور دینیات کے حسین امتزاج نے طلبہ کے ایک ایسے طبقہ کو جنم دیا جس نے نہ صرف جدید علوم سے واقفیت حاصل کی۔ بلکہ اپنی روایات اور تعلیمات کو بھی سیکھا اور اس طرح قوم کے نوجوانوں کا ایک بڑا حصہ مغربیت کے اثر سے بچ گیا۔ تعلیم الاسلام کالج کو ہمیشہ دوسری درسگاہوں کے لئے "مشعلِ راہ" کی حیثیت حاصل رہے گی۔ ہم صرف اسی پر قانع نہیں کہ ہم ایک عظیم درسگاہ کے فرزند ہیں بلکہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ مملکت اسلامیہ میں موجود ہر ایک درسگاہ تعلیم الاسلام کالج کے رنگ میں ڈھل جائے اور ہماری قوم ایک صحیح اور صحتمند مستقبل کے حصول میں مصروف عمل ہو جائے اور وہ وقت جلد آجائے جب ہمارا ہر نوجوان اسلامی کردار کا مرقع نظر آئے۔ (ا۔ ت)

خیر مقدم

یہ امر ہمارے لئے باعثِ صد مسرت ہے کہ ربوہ کے تعلیمی ادارہ جات کی طرف سے شائع کئے جانیوالے جرائد میں ایک اور مجلّہ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ مجلّہ جامعہ نصرت برائے خواتین نے شائع کیا ہے۔ اور اس کا نام "النصرت" ہے ہم اس جریدہ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور محترمہ پرنسپل صاحبہ جامعہ نصرت اور ادارہ "النصرت" کو اس قابلِ قدر اقدام پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ "النصرت" کا طرۂ امتیاز یہ ہونا چاہئے کہ صرف ایسی نگارشات شاملِ اشاعت ہوں جو ہمارے معاشرہ کی صحیح اور صحت مند نشوونما میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ اپنی انفرادی اقدار کو قائم رکھنا اور ایک پاکیزہ ادب کی تخلیق ہمارا نصب العین ہونا چاہئے اصل کمال یہ نہیں کہ ہم حالات کے مطابق ڈھل جائیں بلکہ قابلِ تعریف امر یہ ہے کہ ہم اپنے اندر حالات کو بدل ڈالنے کی قوت و طاقت پیدا کریں۔ "النصرت" کا لائحہ عمل یہ ہونا چاہئے کہ اس نے ہر قسم کے جدید اثرات سے بچکر اپنے لئے ایک علیحدہ اور مخصوص راہ کا انتخاب کرنا ہے اور یہی "النصرت" کے شایانِ شان ہے۔ خدا کرے کہ "النصرت" محترمہ ڈائریکٹریس صاحبہ جامعہ نصرت کے پیغام کی روشنی

میں اس تہذیب کا علمبردار ہو جو آج سے چودہ سو سال قبل حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے تھے۔

ہم امید رکھتے ہیں کہ آئندہ "النصرت" کے کالموں میں کسی قسم کی سستی جذباتی نگارشات کا اعادہ نہیں کیا جائیگا جو ہمارے خیال میں محض ناتجربہ کاری اور کسی فروگذاشت کی بنا پر شریک اشاعت ہوگئی ہیں۔

ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر دو کلیہ کے جرائد کو موجودہ ترقی یافتہ ادب کے مسموم اثرات سے پاک رکھے اور "فاستبقوا الخیرات" اور "علم و عمل" کے پیارے اصولوں کو اپنانے کی توفیق دے۔ آمین۔ (ر۔ ت)

الوداع:- گذشتہ اڑھائی سال سے "المنار" کی ترتیب و تدوین کا کام ہمارے سپرد رہا ہے۔ ہم نے جہاں تک ممکن تھا اپنی محدود صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے فرائض کو کما حقہٗ نبھانے کی کوشش کی۔ وہ کٹھن اور ناقابل عبور مراحل جن سے گذر کر "المنار" آپ تک پہنچتا رہا ہے ایک لمبی داستان ہے جس کو ہم یہاں بیان نہیں کرنا چاہتے۔ ہم نے ہر مشکل کے باوجود "المنار" کو اس کے معیار کے مطابق منصۂ شہود پر لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور اس میں نہ مبالغہ ہوگا اور نہ ہی خودستائی اگر ہم یہ کہدیں کہ ہم اپنی کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ غیر ارادی فروگذاشتوں کے قطع نظر ہم نے ایک سنجیدہ اور تعمیری طرزِ فکر کو اپنائے رکھا۔ ہم نے "المنار" کی تدوین میں ہمیشہ ان پاکیزہ اقدار کو ملحوظ رکھا۔ جو اس درسگاہ کا طرۂ امتیاز ہیں ہماری اس کوشش اور طرزِ عمل کو اہلِ دل قارئین نے سراہا بھی اور ہمیں خراجِ تحسین بھی پیش کیا۔ ہم نے ہمیشہ طلباء کے جذبات کی صحیح رنگ میں ترجمانی کی۔ اور اپنی ذاتی آرا کالموں میں شامل کرنے کی بجائے ان میں قومی آرزوؤں اور ملی اقدار کا رنگ بھرا۔ غرضیکہ ہم نے اپنے نگران محترم چوہدری محمد شریف صاحب عاقد کی قابلِ قدر رہنمائی میں کشتیٔ "المنار" کو نہایت کامیابی سے چلایا۔ المنار کا ہم پر احسان ہے جب ہم اس سے وابستہ ہوئے تو بالکل مبتدی تھے اس کی ادارت میں ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ ہم نے "المنار" سے روشنی حاصل کی، درسِ محنت کا درس لیا۔ ہم صمیم قلب سے المنار کے اس احسان کے معترف ہیں۔ اب یہ ہمارے دورِ ادارت کا آخری شمارہ ہے جس کے بعد ہم رخصت ہوتے ہیں المنار کے کالموں سے، اپنے مشفق اور واجب الاحترام اساتذہ سے، اپنے قابلِ قدر ساتھیوں سے، اور اپنی عظیم درسگاہ سے جس کی چار دیواری میں ہم نے پانچ سال تک فیضانِ تربیت حاصل کیا۔ اور جس پر ہم عمر بھر فخر کرتے رہیں گے۔ تعلیم الاسلام کالج سے ہمیں بے پناہ عقیدت اور محبت ہے جبتک ہم یہاں زیر تعلیم رہے ہیں ہم نے ایک لمحہ بھی اس عظیم و جلیل مقصد کو فراموش نہیں کیا جسکے مدنظر اس درسگاہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اسی جذبہ اور اسی فیضانِ تربیت کا کرشمہ ہے کہ آج ہم یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے نہایت خود اعتمادی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے مقصد کو اپنی استطاعت کے مطابق پا لیا ہے۔ اب ہم نہایت اعتماد اور عزم کے ساتھ نئی منزل کی طرف رواں دواں ہو رہے ہیں۔ آخر میں ہماری دعا ہے کہ ہمارا تعلیم الاسلام کالج ہر لحظہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور ہمارا یہ مجلہ المنار بھی انہی اقدار کے ساتھ مصروفِ عمل رہے۔ آمین اللّٰھم آمین۔ والسلام

نیازمندان

ارشد ترمذی
رشید احمد جاوید

دھریہ مذہب کی تردید

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قلم سے

سوال دہریہ: ۔ خدا کا اگر جسم نہیں ہے تو کیا چیز ہے؟

جواب: ۔ جسم اسے کہتے ہیں۔ کہ وزن ہو سکے۔ کہ اتنے سیر ہے یا اتنے من ہے اور مساحت ہو سکے کہ اتنا لمبا ہے یا اتنا چوڑا ہے۔ خدا ایک نور ہے جو سب نقصانوں سے پاک ہے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ جب ہم روح کی طرف دیکھتے ہیں۔ تو ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں کہ جسم نہیں ہیں اور پھر موجود ہیں۔ وفی انفسکم افلا تبصرون۔

ایک دلیل وجود خدا تعالیٰ پر یہ ہے کہ زمانہ کا ابتداء ضرور ایک ماننا پڑتا ہے کیونکہ اگر زمانہ کا ابتداء نہیں تو چاہیئے کہ بنی آدم تمام زمین کو روک لیں۔ اور ایک گوشہ جگہ خالی نہ رہے حالانکہ حکیموں نے تجربہ کر کے تخمینہ لگا دیا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت سے سات ہزار برس تک تمام ربع مسکون بھر سکتا ہے اگر سات ہزار برس سے زیادہ مدت گذرے تو اس کے واسطے کوئی اور زمین چاہیئے۔ ہر ایک آدمی سوچ سکتا ہے کہ اس کی قوم کے کس قدر آدمی دنیا میں پہلے ہوئے ہیں۔ مثلاً آج سے آٹھ سو برس سے مغول نام ایک شخص تھا جس کی اولاد قوم مغل ہے۔ اب شمار کرو کہ اب کتنے مغل ہیں اسی طرح کل عرصہ تین سو برس کا گذرا ہے کہ بابا نانک صاحب ایک شخص ہوا ہے اب اس کی اولاد ہزارہا ہوتی ہے۔ اس دلیل سے معلوم ہوا کہ دنیا کا ایک ابتداء ہے اور ایک انتہا ہے ابتداء اس سے ثابت ہوا کہ جب ہم اوپر کی طرف نظر کرتے جاؤ تو دنیا کا ابتداء ثابت ہوتا ہے اور انتہاء اس سے ثابت ہوا کہ زمین ایک محدود میدان ہے غیر محدود پیدائش کی گنجائش نہیں رکھتا تو ناچار کسی دن اس دنیا کا خاتمہ ہے پس جس چیز کی ابتداء اور انتہا ہے وہ چیز مصنوعی ہے قدیمی نہیں رہ سکتی اور جب مصنوعی ہوئی تو اس کا ایک صانع ماننا پڑا اور وہ خدا ہے۔

اگر یہ کہو کہ بعض خاندان میں کثرت اولاد نہیں اتنے کے اتنے ہی رہتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک عارضہ ہے ورنہ تجربہ سے ثابت ہے کہ ایک بکری آدمی خرید تا ہے تو اس کا ریوڑ بن جاتا ہے اور یہ ایک قاعدہ ہے کہ دنیا میں طبعی موت ساٹھ ستر برس کے بعد آتی ہے۔ اور پیدائش پندرہ برس کے بعد شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس پر صاف دلیل یہ ہے کہ جو جگہ میرے پہلے آباد نہ تھے وہ اب آباد ہیں۔

دوسری دلیل وجود واجب الوجود پر یہ ہے کہ کوئی مصنوع بغیر صانع کے نظر نہیں آتا۔ ایک چھوٹا سا کوٹھا بغیر بنانے والے کے بن نہیں سکتا۔ پھر اتنا بڑا کوٹھا کہ جس کے فرش کا محیط چھ بیس ہزار میل سے زیادہ ہے اور جس کی سقف کمال صفائی سے محکم طور پر بنائی گئی ہے اور جس کے اوپر چراغ رکھے ہیں کہ تا روشنی بخشیں اور ایسی ترتیب ہے کہ ایک کو سب سے اعلیٰ بنایا ہے اور باقی کو روشن تابع مقرر کیا ہے کس طرح بغیر بنانے والے کے خود بخود بن گیا۔

اس جگہ دہریہ یہ سوال کرتے ہیں کہ دنیا کے کوٹھوں کو بنانے والوں کو ہم بچشم خود دیکھ سکتے ہیں لیکن آسمان زمین بنانے والا ہم کو نظر نہیں آتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوٹھا بنانے والا نظر آتا ہو تو دلیل پکڑنے کی کیا حاجت تھی دلیل تو اسی جگہ پکڑی جاتی ہے کہ جب ایک شے کا وجود بغیر اس کے نظر آنے کے ثابت کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو مصر میں ایسی ایسی قدیم عمارتیں موجود ہیں کہ اب اس زمانہ کے لوگ اس کو بنا نہیں سکتے۔ لیکن یہ یقین کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ معمار تھے جنھوں نے ان کو بنایا۔ مصنوع کے صانع پر ذاتی دلالت ہے خواہ صانع نظر آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ اگر ایک آدمی ایک نئی کل پیدا کرے جو ایک آدمی نے پہلے نہیں کی۔ اور اس جنس کی صنعت پہلے کسی نے نہیں بنائی۔ اور وہ آدمی ہم نے دیکھا بھی نہ ہو۔ تو کیا ہم الیسا خیال کرینگے کہ وہ صنعت خود بخود بن گئی۔ ہر ایک عقلمندی کا کام ایک عاقل کی دستکاری پر دلالت کرتا ہے یہ مثال تعصب اور تاریکی نفس ہے کہ باوجود اقرار اس بات کے کہ ایک صنعت کو دیکھ کر یہ کہیں کہ فی الحقیقت یہ عاقلانہ کام ہیں پھر انکار کریں کہ کسی عاقل کی بنائی ہوئی نہیں۔ ذی شعور اور غیر ذی شعور کے فعل میں ہمیشہ ایک فرق ہوتا ہے جس مصنوع میں یہ علامت پائی جاوے کہ اس کے صانع نے اپنے مطلب کو بالارادہ مدنظر رکھا ہے اور فعل عبث نہیں تو اس مصنوع پر عقل سلیم حکم کرے گی کہ یہ کسی صانع ذی شعور کا فعل ہے جیسے اگر کسی کاغذ پر سیاہی گر جاوے تو ممکن ہے کہ انسان نے گرائی ہو یا کسی چوہے نے گرائی ہو یا یونہی اتفاقاً گر پڑی ہو لیکن اگر کسی کاغذ پر ایک صفحہ کسی کتاب کا لکھا جائے جو کوئی ضروری مطلب اس سے معلوم ہوتا ہو۔ تو کوئی دانا نہیں کہے گا۔ کہ خود بخود بغیر کاتب کے لکھا گیا پھر گو یہ ایسی وضع کے حرف ہوں کہ پہلے اس وضع کے حرف ہم نے نہیں دیکھے لیکن جب ہم نے غور سے دریافت کر لیا کہ یہ حرف ہیں اور اس کی عبارت میں صدہا صفحہ پر برابر لکھتے چلے گئے تو پھر اگرچہ ہم نے اس کے کاتب کو نہیں دیکھا اور نہ اس نئی طرز کے حروف دیکھے لیکن اس میں کیا شک رہے گا۔ کہ ضرور یہ کسی کاتب کی ایجاد ہے۔

دیکھو اگر یہ کوٹھا زمین و آسمان ایک چھوٹا کوٹھا ہوتا۔ تو تم اس کی کمال خوبصورتی دیکھ کر ضرور کہتے کہ کسی دانا انسان کا بنایا ہوا ہے۔ پس اب سوچنا چاہیئے کہ جس حالت میں اگر یہ چھوٹا کوٹھا بھی بغیر بنانیوالے کے نہیں بن سکتا تھا تو اب کہ بڑا کوٹھا ہے بغیر بنانے والے کے کس طرح بن گیا۔

تیسری دلیل وجود خداوند تعالیٰ پر یہ ہے کہ دنیا

ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چیز دوسری چیز کی مدد سے تیار ہوتی ہے جیسے درخت پانی کی مدد سے۔ اور بارش ہوتی ہے آفتاب کی مدد سے اور وجود حیوانات کا ہوتا ہے دوسرے حیوانات کی مدد سے اور زمین پر کوئی چیز نظر نہیں آتی کہ بغیر دوسری کے اس کا بچہ ہو سکے یا پیدا ہو سکے۔ پس ایک وجود ایسا ماننا پڑا جو سب کا مددگار ہو۔

آدمی بنا نطفہ سے اور نطفہ بنا اناج سے اور اناج بنا مٹی سے اور مٹی کہاں سے بنی؟ اگر کہو کہ مٹی خود بخود چلی آئی ہے تو یہ بات ناقص ہے کیونکہ خود بخود وجود اس چیز کا ہوتا ہے جو دوسرے کی کسی حالت میں محتاج نہ ہو لیکن مٹی اکٹھا رہنے میں پانی کی محتاج ہے اگر مٹی میں پانی نہ ملا ہوا ہو تو ہوا اڑا کر لے جائے اور نیز مٹی نباتات کے اگانے میں پانی کی محتاج ہے اور کوئی محتاج چیز قدیمی نہیں ہو سکتی۔ اور محتاج کو نہیں کہہ سکتے کہ اس کا وجود واجب ہے علاوہ اس کے مٹی سے درخت پیدا ہوتے ہیں اور وہ اس سے بہترین اور ناقص واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔

دلیل چہارم یہ ہے کہ فرمایا ہے خدا تعالےٰ نے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ اور نیز فرمایا ہے۔ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ان دونوں آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ ملاحظہ عالم سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک چیز ایک چیز کی خالق اور فاطر ہے جیسے سورج کی گرمی سے بخارات پیدا ہوتے ہیں اور بخارات سے بادل پیدا ہوتا ہے۔ اور بادل سے پانی پیدا ہوتا ہے اور پانی سے پھل پیدا ہوتے ہیں لیکن خدا احسن الخالقین ہے اور اسی طرح خدا فاطر السموات والارض ہے جو ان کو عدم سے وجود بخشتا ہے۔

پھر اگر وجود خدا نہ ہو تو دروازہ تمام خیرات کا بند ہو جاتا ہے کیونکہ تمام لوگ اس طرح خیرات کرتے ہیں کہ اس خیرات کے دینے سے ہمارا فائدہ ہے اور کوئی شخص بلاحاظ فائدہ نقصان کے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ ایسا کام اس کی نظر میں محض عبث ٹھہرتا ہے اسی طرح وجود خدا نہ ماننے والا بدی سے ڈر نہیں سکتا۔ کیونکہ بدی اسی لحاظ سے بدی ہوتی ہے کہ اس کا یہ نتیجہ ہے اگر اس کا نتیجہ بد نہ کہا جائے تو پھر ہر گز دل اس کو بد نہیں خیال کر سکتا۔ پھر اگر بدی کرنے میں کسی کا خوف نہ ہو تو پھر بدی کرنے سے کون مانع ہے۔ اور اگر کہو کہ بادشاہ اور حاکم مانع ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ بادشاہوں اور حاکموں کو کون مانع ہے جو شخص صاحب قدرت ہے اس کو کس کا خوف ہے علاوہ اس کے حاکم اور بادشاہ ہر وقت حاضر ناظر نہیں ہوتے اور نہ انسان خیال کرتا ہے کہ وہ میرے کاموں کو ہر وقت دیکھتے ہیں۔

اور یہ جو کہتے ہیں کہ ہم زمین و آسمان کے صانع کو نہیں دیکھتے۔ اس واسطے اس پر ایمان نہیں لاتے یہ انکی صاف شرارت ہے کیونکہ اگر اس دنیا میں صانع دیکھا جاتا تو پھر یہ دنیا دنیا نہ رہتی اور نہ کسی کو نیک کام کرنے میں ثواب ہوتا۔ اس واسطے کہ ثواب اسی وقت تک ہے کہ جب آدمی تقویٰ اختیار کر کے بحالت پوشیدگی خدا کے اوپر ایمان لاوے اور اگر خدا اپنی ذات کو خود بخود ظاہر کرے تو پھر اس کا ثواب کیا۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ یعنی یہ کتاب متقیوں کے

لئے ہدایت ہے جو خدا پر حالت پوشیدہ ہونے اس کے بیں ایمان لاتے ہیں۔

دوسری دلیل وجود خدا تعالیٰ پر یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے خیالات کا اسی پر اتفاق ہے کہ ایک ذات رب العالمین ہے اور نیز اس بات پر اتفاق ہے کہ حقیقت میں صنعت زمین آسمان کی ایک ایسی صنعت ہے کہ بجز صانع کے ہرگز نہیں بن سکتی۔ پس جس بات کو بہت دانا تجویز کریں۔ وہی حق ہوتی ہے۔ "سو سیانے اکو مت مورکھ اپو اپنی"!

دہریہ کہتے ہیں کہ ہم نے زمین و آسمان کے صانع کو ..... نہیں دیکھا اور صانع ہر ایک چیز کے ہم کو نظر آتے ہیں پھر کس طرح وجود صانع پر یقین کریں اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اگر صانع نظر نہ آوے تو مصنوع تو نظر آتا ہے اور اگر شئے مصنوع ہے اور نہایت کاریگری سے بنائی گئی ہے۔ مگر اس کا صانع نظر نہیں آتا۔ تو یہ تو ہم ضرور کہیں گے کہ کسی شخص نے اس کو ضرور بنایا ہے بحث تو یہ ہے کہ مصنوع صانع پر دلالت کرتا ہے یا نہیں دہریہ کہتے ہیں کہ خواہ نہایت ہی عقلمندی کا کام ہو اور بڑے درجہ کی کاریگری ان میں پائی جاتی ہو۔ پھر بھی جب تک ہم صانع نہ دیکھیں گے اس پر ایمان نہ لائیں گے یہ ان کی شرارت ہے ورنہ صانع کے دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں جو کام عقلمندی کا ہے تو یہ اختیار ہمارے دل میں بیٹھ جائے گا۔ کہ کسی عاقل نے بنایا ہے۔

زمین و آسمان میں جتنی چیزیں ہیں ہم ان کو بچشم خود دیکھتے ہیں کہ ایک چیز دوسری چیز کی مدد سے بنتی ہے اور ایک چیز دوسری چیز کی مدد سے قائم رہتی ہے بلکہ زمین آسمان کی مدد سے اپنی طاقتیں ظاہر کرتی ہے اس صورت میں یہ سوال دہریہ پر ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کس کی مدد اور آسرا سے پیدا ہوئے ہیں اور اب تک قائم رہے ہوئے ہیں۔ دہریہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ زمین و آسمان اپنی شہادت سے قائم ہیں پس ان پر یہ سوال ہوتا ہے کہ سبھاؤ باپ کا بیٹے سے پہچانا جاتا ہے جو کچھ زمین و آسمان میں پیدا ہوتا ہے وہ ان دونوں کا بیٹا ہے وہ بغیر آسرے کے ٹھہر نہیں سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہی سبھاؤ زمین و آسمان ہے کیونکہ مولود کا والد سے مختلف سبھاؤ نہیں ہو سکتا جو کام عقلمندی کا ہے جب ہم پر ثابت ہو جاوے گا کہ عقلمندی کا ہے تو پھر اس بات کی حاجت نہ رہیگی کہ پھر ہم اس کے صانع کو دیکھیں۔ دلیل اس پر یہ ہے کہ جس فعل میں صریح معلوم ہو کہ اس کے فاعل نے دیدہ و دانستہ اس کی بنا لی ہے ایک بات کا قصد کیا ہے تو اس بات کو کوئی ودّیادان اتفاقی طور پر نہیں مانے گا بلکہ یہی سمجھیگا کہ ضرور اس کا ایک فاعل ہے مثلاً اگر سیاہی کاغذ پر یونہی پڑ جائے تو اس میں شک ہوگا۔ کہ کس طرح پڑ گئی۔ لیکن اگر ورق دو ورق حروف لکھے جائیں اور حرف بھی وہ حرف کہ جس میں کوئی مقصد کاتب کا معلوم ہوتا ہو تو اس کو کوئی عقلمند نہیں کہیگا کہ خود بخود لکھے گئے۔

پھر دہریہ سے یہ سوال ہے کہ سورج اور چاند اور زمین اور ہوا جو تمہاری خدمت میں مشغول ہیں اور ایک دم تمہاری خدمت سے الگ نہیں ہوتے۔ تم

ان کا احسان مانتے ہو یا نہیں ۔ اگر تم کہو کہ بغیر شعور کے یہ کام ہیں لگے ہوئے ہیں تو یہ غلط ہے کیونکہ جو فعل بغیر شعور کے اور بغیر نگرانی دوسرے کے ہوتا ہے وہ بگڑ جاتا ہے ۔ اور اگر شعور سے ہو تو تم کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے ۔ پھر دہریہ سے ہمارا یہ سوال ہے کہ آفتاب کا نکلنا اور بارشوں کا ہونا اتفاقی ہے یا کسی کے تصرف سے ۔ اگر اتفاقی ہے تو چاہیئے کہ ..... دنیا نہ رہے اور بہت بارشوں سے یا بہت دھوپوں سے فصل برباد ہو جائے ۔ کیونکہ اتفاقی امر ... خطا بھی ہو جاتا ہے ۔ اور اگر ..... کسی تصرف سے ہے تو وجود خدا کا ثابت ہوا ۔ کیونکہ خدا وہی ہے جو دنیا میں متصرف ہے

پھر دہریہ کہتے ہیں کہ کسی نے خدا کو دیکھا نہیں اگر خدا کا وجود ہوتا تو اس کو کوئی دیکھتا ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بندوں کو خدا دل کی آنکھ سے اپنا دیدار دکھاتا ہے پھر جو لوگ ان کے تابع ہوئے اور ان کی پیروی کی وہ اس درجہ تک پہنچ گئے جو ان کو خدا تعالیٰ اپنی پہچان بخشے اس صورت میں یہ دعوے جو کسی نے خدا کو دیکھا نہیں باطل ہوا ۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک اندھا وجود آفتاب سے منکر ہو اور کہے کہ جب تک میں نہ دیکھ لوں آفتاب پر یقین نہ کروں گا ۔ اس کا یہی جواب ہے کہ تو اندھا ہے اور آنکھ سے آفتاب کو نہیں دیکھ سکتا ۔ تیرے واسطے طریق حصول تحقیق یہ ہے کہ جنہوں نے دیکھا ہے ان کے بیان پر اعتماد کرنا یا پہلے اپنی آنکھوں کا علاج کرا پھر اسکو دیکھ لینگا ۔ پھر ہم دہریہ سے پوچھتے ہیں کہ سکھ دکھ دینے والا کوئی دوسرا ہے یا اپنی تدبیر سے مل سکتا ہے اگر اپنی تدبیر سے مل سکتا ہے تو کیوں تمام لوگ اپنی عمر زیادہ نہیں کر سکتے ۔ آرام زیادہ نہیں کر سکتے ۔ ایک بوڑھا ہو کر مرتا ہے ایک جوان ہی مر جاتا ہے حالانکہ ہر کوئی عمر زیادہ چاہتا ہے بعض وقت آدمی سکھ چاہتا ہے اور غیب سے اس پر دکھ آ پڑتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ سکھ دکھ دینے والا کوئی اور نہیں ہے اور وہی خدا تعالیٰ ہے ۔

(ملفوظات بدر ۳ جون ۱۹۰۹ء)

بقیہ :- اسلام دین فطرت ہے

یعنی ہمارا نفس لوامہ یہ شہادت دے رہا ہے کہ جزا و سزا برحق ہے ۔ جبکہ نیکیوں کی جزا ملیگی ۔ اسلام نفس لوامہ کی اس مبہم گواہی کی تفصیل و تشریح کر کے واضح الفاظ میں حقیقت کو منکشف کرتا ہے ۔

بقیہ مطالعۂ قدرت

خَيْرًا كَثِيرًا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (بقرہ - ۲۷۰) یعنی خدا جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی تو (سمجھو کہ) اُسے بہت ہی نفع رساں چیز مل گئی ۔ اور (یاد رہے کہ) نصیحت بھی عقل مندوں کے سوا کوئی حاصل نہیں کیا کرتا ۔

ہمیں بھی آسمان و زمین میں بکھرے ہوئے عجائبات کے حسین و جمیل مرقع کا مطالعہ کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ قدرت کے مطالعہ و مشاہدہ سے انسان کے دل میں خدا کی ہستی کا اقرار زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے ۔

پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب ایم۔اے

اسلام دینِ فطرت ہے!

چند دن ہوئے ایک عزیز نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اگر اسلام دینِ فطرت ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ شرعی احکام کی پابندی بعض اوقات گراں گذرتی ہے مثلاً شریعت کا ایک بہت بڑا حکم نماز با جماعت کی پابندی کرنا ہے۔ اگر یہ حکم ایک طبعی اور فطری حکم ہے تو چاہیئے کہ ہر مسلمان طبعاً اس طرف مائل ہو۔ الّا ما شاء اللہ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ عموماً مسلمان اس امر کی پابندی کو ایک بوجھ تصوّر کرتے ہیں سوائے ان کے جو خاص مشاہدے اور کوشش کے بعد اس کے عادی ہو گئے ہیں اس صورت میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ نماز پڑھنے کا حکم ایک فطری حکم ہے۔

سو اس مختصر سے مضمون میں مَیں اسی سوال پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اس سوال کو حل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ فطرت کسے کہتے ہیں انسانی فطرت ان طبعی اور ابتدائی قوتوں، طاقتوں اور جذبات کا نام ہے جو ایک انسان میں بحیثیت ایک انسان بغیر خارجی مؤثرات کے بچپن کے زمانہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کئے جاتے ہیں۔ انسان زمانۂ طفولیت اور بچپن میں ہی ان کا اظہار کرتا ہے اور جُوں جُوں انسان نشوونما حاصل کرتا ہے یہ جذبات بھی خاص رنگوں میں نشوونما پاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ طبعی جذبات مومن و کافر سب میں یکساں اور مشترک ہوتے ہیں۔ کیونکہ سب انسان بحیثیت انسان برابر ہیں۔ اور ان میں کوئی تفاوت نہیں۔ ہاں ظاہر ہے کہ شرعی طور پر معین اور مقررہ صورت میں نماز پڑھنا انسان کی فطرت میں اس رنگ میں تو ودیعت نہیں کیا۔ کہ ہر انسان ایک خاص عمر میں آکر خود بخود نماز پڑھنا شروع کر دے۔ نماز بعد میں سیکھی جاتی ہے فطرتی چیز کو سکھلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بطخ کا بچہ پیدا ہوتے ہی تیرنا شروع کر دیتا ہے کیونکہ یہ اس کے لئے ایک فطری جذبہ ہے نماز کے معاملہ میں ہمیں یہ صورت بظاہر نظر نہیں آتی۔

سوچنا چاہیئے۔ کہ اسلام نے اپنے شرعی احکام میں فطری جذبات کو ایک خاص رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ فطرت کی مثال ایک سواری کی ہے اسلام نے اس سواری کو سدھایا ہے اور اسے صحیح راستے پر ڈالا ہے۔ جس پر چل کر وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ نماز پڑھنا اس صورت میں تو فطرت نہیں جس طرح ہنسنا، غم کرنا ناراض ہونا یا محبت کرنا وغیرہ طبعی جذبات ہیں۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نماز میں ایک طبعی جذبے کو ہی کام میں لا کر ایک خاص راستہ پر ڈالا جاتا ہے اور اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نماز کا حکم فطرتِ انسانی کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے۔

شریعت کے احکام کی پیروی میں بعض دفعہ انسان تردّد محسوس کرتا ہے یہ عدم علم اور عدم معرفت کی وجہ سے ہوتا ہے ہمیں اس امر پر یقین نہیں ہوتا کہ ہماری حقیقی آسائش اسی راستہ پر گامزن ہونے میں ہے اور یقین کی کمی اور فقدان ہی ہمیں اوامر و نواہی کی حقیقی اطاعت سے محروم رکھتا ہے۔

محبت کرنا، کسی محبوب و مطلوب کی اپنے دل میں لو لگانا، کسی غیر معلوم برتر ہستی کی جستجو کرنا، ایک فطری جذبہ ہے انسان رات دن علوم و فنون کی تحقیق و تدقیق میں لگا ہوا ہے۔ یہ اسی جذبہ کی بدولت ہے وہ دراصل ایک نامعلوم حقیقت سے وصال حاصل کرنا چاہتا ہے ہر ایک انسان کو کسی نہ کسی چیز کی لو لگی ہوئی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ، رکوع ۱۴)

یعنی ہر انسان کسی نہ کسی طرف رُخ کرتا ہے۔ اے مسلمانو! تمہارا رُخ اس طرف ہونا چاہیئے کہ تم نیکیوں، بھلائیوں اور اللہ تعالےٰ کو خوش کرنے والے امور میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ نماز میں اسی فطری جذبہ کو کام میں لایا گیا ہے۔ نماز میں ہم اپنے اس فطرتی گھوڑے کا رُخ اللہ تعالےٰ کی جانب کرتے ہیں۔ ہماری فطرت میں ایک غیر معلوم برتر ہستی کی تلاش موجود ہے نماز اسی جذبہ کو منزلِ مقصود سے ہمکنار کرتی ہے اور ایک خاکی انسان کو عرش کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے اسی لئے رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ یعنی نماز مومن کا معراج ہے نماز میں انسان خاکی بلندیوں سے پرواز کر کے بلند ہوتا ہے اور اپنے ازلی محبوب کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے اور راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔ اسی طبعی جذبہ کو قرآن کریم نے ان آیات میں تصویری زبان میں بیان کیا ہے۔ فرماتا ہے:۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ (الاعراف ع ۲۲)

یعنی یاد کرو اس وقت کو جبکہ تیرے رب نے تمام ارواح انسانی کو جمع کر کے انہیں اپنے نفسوں کے جذبات اور رجحانات پر گواہ بنایا اور ان کی فطرت سے سوال کیا۔ کہ کیا میں تمہارا رب نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ہم اس بات پر گواہ ہیں۔ اے انسانو! ہم نے یہ کارروائی اس لئے کی کہ کہیں تم روزِ جزا یہ عذر نہ پیش کرو کہ ہم تو اس راستہ سے بالکل غافل تھے۔

اب یہ بات تو ظاہر و باہر ہے کہ ابتدائے آفرینش میں اس قسم کا کوئی حقیقی اجتماع ارواحِ انسانی تو معرضِ وجود میں نہیں آیا۔ مندرجہ بالا آیت میں تصویری زبان

ہیں اللہ تعالیٰ نے فطرتِ انسان کے ایک اہم جذبہ کو پیش کیا ہے انسانی فطرت میں ایک محبوب و مقصود کی جستجو اور تڑپ ودیعت کی گئی ہے تا اس کے ساتھ وصال حاصل کر کے انسان کو حقیقی راحت و تسکین نصیب ہو۔ شریعت نے اب مزید احکام کے ذریعہ اس جذبہ کے نشوونما کا سامان پیدا کیا ہے۔ اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ پر ڈالا ہے اور برسوں کے سفر کو لمحوں میں اور صدیوں کے سفر کو گھنٹوں میں طے کرنے کے لئے تیز رفتار سواریاں مہیا کی ہیں۔ نماز باجماعت کی مثال ایک ریلوے ٹرین سے بھی دی جا سکتی ہے جس میں بیٹھ کر فطرتِ انسان کا مندرجہ بالا طبعی جذبہ بڑی سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ سفر طے کر کے منزلِ مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ اب یہ امر بھی ظاہر ہے کہ ٹرین میں بیٹھنا کوئی طبعی جذبہ نہیں اور نہ مقصد ہے بلکہ وہ طبعی جذبہ کے مقصود کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور ٹرین میں وہی بیٹھے گا جسے اس پر یقین ہوگا کہ یہ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔ خواہ بظاہر وہاں بیٹھنا اس کے لئے تکلیف اور بوجھ کا باعث ہی ہو۔

حدیث شریف میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ حَتّٰی یُعْرِبَ عَنْہُ لِسَانُہٗ فَاَبَوَاہُ یُہَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ (الطبرانی فی الجامع الکبیر بحوالہ جامع الصغیر) یعنی بچہ فطرتِ صحیحہ لے کر پیدا ہوتا ہے ایسے صحیح جذبات لے کر پیدا ہوتا ہے جن کی شریعت اسلامیہ تربیت کرتی ہے اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ ان بسا اوقات اپنے ماں باپ کے اثر کے تحت وہ شریعت اسلامیہ کی صحیح تربیت سے منحرف ہو کر یہودی عیسائی یا مجوسی بن جاتا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ فطری جذبات کو بنیاد بنا کر اس کے اوپر روحانیت و اخلاق کی عمارت کھڑی کرتی ہے اور دوسرے مذاہب کی بنیاد غیر فطری جذبات پر ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں رہبانیت ایک غیر فطری حکم ہے۔

یہودیت کا یہ حکم کہ ہر موقعہ پر دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ کے اصول پر ہی عمل کرو بھی ایک غیر فطری حکم ہے۔ لیکن اسلام کا کوئی حکم بھی فطرتِ انسانی سے تضاد نہیں رکھتا۔

بعض لوگ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہ کہنا کہ فلاں امر نیکی ہے اور فلاں امر گناہ ہے یہ بھی کسی فطری اصول کے مطابق نہیں۔ فطرت کسی امر کو لازماً گناہ اور کسی امر کو لازماً نیکی کا درجہ نہیں دیتی۔ اس کا مختصراً جواب یہ ہے کہ اس امر کو تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ فطرتِ انسانی بعض باتوں کو اچھا اور بعض باتوں کو بُرا کہتی ہے ہر انسان خواہ وہ کسی ضابطۂ حیات کا پابند ہو، وہ کسی بات کو اچھا اور کسی بات کو بُرا کہے گا۔ یعنی وہ اپنے اندر ایک نفسِ لوّامہ کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے لئے یہی کافی ہے کیونکہ یہی امر اس بات کی دلیل ہے کہ فطرت کی اس آواز کے جواب میں اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا نزول ہونا چاہیئے۔ جو ہمیں یقینی طور پر بتائے کہ فلاں امر نیکی ہے اور فلاں امر گناہ ہے۔ قرآن کریم سے نفسِ لوّامہ کی اس گواہی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (سورۃ قیامہ) کہ میں نفسِ لوّامہ کی قسم کھاتا ہوں۔ (باقی برصفحہ ۱۲۳)

ممتاز احمد
ایف اے سال دوم

مطالعہ قدرت

اس عالم ارض و سما میں جو شخص بھی مطلق مطالعہ پر اکتفا کرتا اور اپنی معلومات کی افزائش کے لئے محض کتابوں کا کیڑا بنا رہتا ہے وہ کبھی مقصد حیات کے حصول میں کمال کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ یقیناً وہ ایک ایسے فیضان سے محروم ہو جاتا ہے جسے عرف عام میں "فیضان مشاہدہ" کہا جاتا ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ جب ہماری آنکھیں اور ہمارے دل "مشاہدہ" کی لذت سے آشنا ہو جائیں تو مطالعہ اس کے مقابلہ میں بالکل غیر ضروری اور لایعنی شے معلوم ہوگا۔ نظری علم سے ہمیں اشیاء کا ایک دھندلا سا ذہنی اندازہ حاصل ہوتا ہے جبکہ مشاہدہ اور معائنہ سے ہر چیز کے اجزائے ترکیبی اور باریک در باریک راز اپنی اصلی ہیئت میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ پہلی حالت کو علم الیقین اور دوسری حالت کو حق الیقین کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے حق الیقین کا درجہ حاصل کرنے کے لئے ہماری حواس ظاہر کائنات میں معرفت اور بصیرت کا اتنا کافی اور وافی سرمایہ مہیا کیا ہے کہ قرآنی اشارات کے مطابق روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر سیاہی میں منتقل ہو جائیں جب بھی اس کی تفصیل نہیں لکھی جا سکتی۔ قدرت کے اس وسیع اور غیر محدود فیضان کے باوجود اگر انسان عجائبات قدرت سے ایمان اور عرفان کا سبق نہ سیکھ سکے۔ تو یہ اس کی اپنی کور چشمی اور بدبختی ہے۔

قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اس "مشاہدہ" کی ترغیب دلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

(البقرۃ ۱۶۵)

یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات اور دن کے آگے پیچھے آنے اور ان کشتیوں میں جو انسانوں کو نفع دینے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ نے بادل سے اتارا پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلائے۔ اور ہواؤں کے ادھر ادھر

پھیلانے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں یقیناً اس قوم کے لئے جو عقل سے کام لیتی ہے کئی قسم کے نشان ہیں۔[1]

نیز فرمایا۔ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات ۲۱-۲۲) اور (اس) زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے بہت سے نشانات ہیں اور تمہاری اپنی جانوں (اور ہستی) میں بھی۔ کیا تم دیکھتے نہیں۔ اور پھر سورۂ سجدہ میں غور و فکر اور مشاہدہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ۝ اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے (فائدہ اور بہتری کے) لئے کان اور آنکھ اور دل بنائے مگر تم بالکل شکر نہیں کرتے۔[2]

غالبؔ نے اس نکتے کو اور بھی لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے اس کا شعر ہے۔ ؎

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد نظر گاہِ حیا ہے

یعنی ہم جو گلِ لالہ پر شبنم کے قطرات دیکھ رہے ہیں ان کا ہونا خالی از علت نہیں۔ بلکہ اس سے یہ حکمت سکھانا مراد ہے کہ وہ دل جو سوزِ عشق سے ناآشنا ہو۔ اور قدرت کے عجائبات کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ بجائے خود نایاب وجود ہے۔ چنانچہ گلِ لالہ ہی کو دیکھو اگرچہ وہ اپنے دل میں داغ رکھتا ہے۔ مگر یہ داغ محض مصنوعی اور سوزِ عشق سے محروم ہے، اسی لئے تو اس پر شبنم کے یہ قطرات صاف طور پر ظاہر کر رہے ہیں کہ اسے اپنی محرومی پر ندامت کی وجہ سے پسینہ آگیا ہے،

میر انیسؔ قدرت کی غیر متناہی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے تحیر کا اقرار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:۔

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن کوہ، دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

محاسنِ قدرت کی عظمت اور ضرورت کے متعلق ورڈز ورتھ (Words Worth) کہتا ہے

One impulse from a vernal wood
May teach you more of man,
Of moral evil and of good,
Than all the sages can!

کسی شاعر نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔

اک تأثر ہی سبز جنگل کا
خیر و شر کے بتا گیا اسرار
جن میں دانا تمام دنیا کے
خود کو پاتے ہیں عاجز و لاچار

پس کائناتِ علوی و سفلی کے مشاہدہ سے انسان کو جو شعور حاصل ہوگا۔ وہ خالصتاً ایک ایمانی اور الٰہی شعور ہوگا۔ اسی شعور کا دوسرا نام حکمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خیرِ کثیر سے تعبیر کیا ہے فرمایا۔ یُؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ

---

[1] نیز ملاحظہ ہو آلِ عمران ۱۹۰، جاثیہ ۹۔ [2] سورۂ جاثیہ کی آیت ۵ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ [3] نیز دیکھئے المؤمنون ۷۹، الملک ۲۴)

رحمۃ للعالمین کا اپنے دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک

(محمد داؤد طاہر، بارہویں جماعت)

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ بنا کر بھیجا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ"

یعنی اے محمد رسول اللہ! ہم نے تجھے تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ آیت ہذا سے واضح طور پر یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف عالمِ انسانیت کے لئے رحمت ہیں بلکہ آپؐ زمین و آسمان کے تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں خواہ وہ عالمِ افلاک ہو یا عالمِ آتش و باد۔ اشجار و احجار کا عالم ہو یا چرند و پرند کا۔ آپؐ رحمت تھے مردوں کے لئے آپؐ رحمت تھے عورتوں کے لئے۔ آپؐ رحمت تھے بیماروں کے لئے۔ آپؐ رحمت تھے حاجتمندوں کے لئے۔ آپؐ رحمت تھے دنیا کے بادشاہوں کے لئے۔ آپؐ رحمت تھے دنیا کے فقیروں کے لئے۔ اسی طرح آپؐ جانوروں کے لئے بھی رحمت تھے۔ اور نہ بولنے والے بہائم اور مصیبت زدہ افراد کے لئے بھی رحمت تھے۔ اسی طرح دوستوں اور دشمنوں کے لئے بھی آپؐ رحمت تھے۔ ایک ناواقف انسان جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے بیگانہ ہو وہ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ انسان اپنے دشمنوں کے لئے بھی رحمت ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر رسول کریمؐ کی زندگی جو ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے صاف بتا رہی ہے۔ کہ آپؐ عالمِ اعداد کے لئے بھی مجسم رحمت و شفقت تھے۔ آپؐ نے ہزاروں مصیبتیں برداشت کیں۔ لاکھوں شدائد اپنے نفس پر اور اپنے اعوان و انصار اور مخلص ترین صحابہ پر وارد ہوتے ہوئے دیکھے مگر آپؐ نے صحابہ کرام کو ہاتھ اٹھانے سے ہمیشہ منع فرمایا اور دشمنوں کی چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں صبر و عفو سے کام لینے کی تلقین کی۔ آپؐ کی آنکھوں نے سمیہؓ کو جو ایک لونڈی تھی مگر دولتِ ایمان سے بہرہ ور تھی برچھیوں سے چھلنی ہوتے دیکھا۔ آپؐ نے بلالؓ کو تپتے ہوئے صحراؤں میں چلتے اور گھسیٹے جاتے دیکھا۔ آپؐ نے دہکتے ہوئے انگاروں پر اپنے صحابہ کو جبراً لیٹتوں کے بل لٹائے جاتے دیکھا۔ خود آپؐ کا گلا گھونٹا گیا۔ آپؐ کے کندھوں پر گوبر وغیرہ ڈالا گیا۔ آپؐ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کی گئی۔ آپؐ کے سر پر مٹی اور راکھ ڈالی گئی۔ آپؐ کے رستہ میں کانٹے بچھائے گئے حتیٰ کہ بارہا آپؐ کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔

مگر جب صحابہ نے ایک دفعہ ان مظالم کو برداشت نہ کرتے ہوئے حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں عرض کیا کہ ان کفار کے لئے بد دعا کیجئے تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ فرمایا۔ تم سے پہلی قومیں آروں سے زندہ چیر دی گئیں مگر انہوں نے اُف تک نہ کی۔ تم بھی صبر سے کام لو دشمن کے مقابلہ میں اپنے اخلاق اٹھاؤ۔ جب تکالیف بڑھ گئیں تو آپؐ نے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ نہیں کہا کہ اُٹھو اور ان سے جنگ کرو۔ اور پھر جب اور مصیبت بڑھی تو آپؐ نے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ دیا اور دو اڑھائی سو میل کا دشوار گزار اور بے آب وگیاہ علاقہ طے کرتے ہوئے مدینہ منورہ میں جا ڈیرہ لگایا۔ ان تمام مظالم کو برداشت کرتے کرتے ۱۳ سال گذر گئے۔ کیا دنیا کی کوئی قوم اس قسم کی رحمت کا اظہار اپنے کسی ہادی میں پیش کر سکتی ہے؟

اب میں مضمون کی مناسبت کے لحاظ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں چند واقعات پیش کروں گا جن سے آپؐ کی اس عظیم خوبی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْق۔

(۱)

شعب ابی طالب سے رہائی حاصل کرنے کے بعد جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ مکہ کے لوگ بت پرستی کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ تو آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ طائف[1] جا کر وہاں کے لوگوں کو دین حق کی طرف بلائیں۔ چنانچہ اس غرض سے شوال ۱۰ سنہ نبوی میں آپ طائف تشریف لے گئے۔

وہاں آپؐ نے خواص وعوام تک اسلام کا پیغام پہنچایا لیکن وہاں کے لوگ مکہ کے لوگوں سے بھی بڑھ کر سنگدل اور بے رحم ثابت ہوئے۔ رؤساء کے ایماء پر شہر کے آوارہ اور بدمعاش آپ کے پیچھے لگ گئے اور آپؐ کو شہر کے باہر دھکیلنے کے لئے آپؐ پر پتھر برسانے شروع کر دیئے جس سے آپؐ کا سارا بدن خون سے تر بتر ہو گیا۔ برابر تین میل تک یہ لوگ آپؐ پر پتھر برساتے اور آپؐ کو گالیاں دیتے چلے گئے۔

سفر سے واپسی کے دوران اس تکلیف دہ اور دردناک حالت میں آپؐ کے پاس مَلَکُ الْجِبَال آیا۔ اور کہنے لگا "مجھے خدا نے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تا اگر ارشاد ہو تو میں پہلو کے دونوں پہاڑ ان لوگوں پر پیوست کر کے ان کا خاتمہ کر دوں"[2] لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ فرشتے کی اس پیشکش کو قبول فرما لیتے کمال رحمدلی اور شفقت کے ساتھ بہترین حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"نہیں نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ
انہی لوگوں میں سے وہ لوگ پیدا کر دیگا
جو خدائے واحد کی پرستش کریں گے"[3]

(۲)

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار مکہ کی آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے رات کی تاریکی میں خدا تعالیٰ کے حکم کے تحت مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تو کفار کو بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے ہر ممکن رنگ میں آپؐ کی تلاش کی لیکن جب ناکامی ہوئی تو اعلان کر دیا کہ جو شخص محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا ابوبکرؓ کو زندہ یا مردہ حالت میں ہمارے پاس لائے گا۔ اس کو ایک صد اونٹنیاں انعام دی جائیں گی۔ سراقہ بن مالک

---

[1] طائف ایک سرسبز وشاداب اور مشہور مقام جو کہ مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ [2] ابن سعد بحوالہ سیرۃ خاتم النبیین حصہ اول مصنفہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب مدظلہ۔ [3] سیرۃ خاتم النبیین حصہ اول۔

جو کہ ایک بدوی رئیس تھا۔ یہ سنکر آپؐ کی تلاش میں میں روانہ ہوا۔ آخر مدینہ کی طرف جانے والی سڑک پر اس نے دو اونٹنی سوار دل کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ یہ حضرت محمدؐ اور ابوبکرؓ ہی ہیں۔ اس نے اپنا گھوڑا آپؐ کے پیچھے بھگایا لیکن رستہ میں گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سراقہ نیچے آرہا۔ اس نے عرب کے رواج کے مطابق تیر سے فال نکالی۔ فال بُری نکلی۔ مگر انعام کے لالچ نے ایک دفعہ پھر اسے ہمّت دلائی۔ اس نے دوبارہ گھوڑے کو بھگایا۔ مگر پھر گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ جب دو تین مرتبہ ایسا ہوا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ خدائی حفاظت میں ہیں چنانچہ اس نے انہیں اپنی طرف بلایا اور کہا کہ میں اس ارادہ سے آیا تھا۔ لیکن اب میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا ہے۔

آپؐ نے بجائے اس کے کہ اسے قتل کر دیتے۔ اس لئے کہ وہ آپؐ کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے آیا تھا۔ اسے کچھ نہ کہا۔ بلکہ اس کی خواہش پر اسے پروانۂ امن بھی لکھ دیا۔

کیا یہ واقعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اپنے دشمنوں کے ساتھ بے نظیر حسنِ سلوک کو ظاہر نہیں کرتا؟ کیا یہ واقعہ اس بات پر شاہد نہیں کہ آپؐ بہت دریا دل تھے ۔۔۔ اتنے کہ اپنے جانی دشمنوں کو پشیمانی پر بِل لائے بغیر معاف کر دینے سے بھی گریز نہ فرماتے تھے؟[۱]

(۳)

جنگِ بدر کے اختتام پر جب کفّار کا لشکر بھاگ گیا تو علاوہ مالِ غنیمت کے تقریباً ۷۰ قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ان قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا؟ کیا انہیں مار دیا گیا؟ نہیں! تو کیا پرانے رسم و رواج اور دستورِ عرب کے مطابق ان جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا گیا؟ نہیں!! بلکہ انہیں فدیہ پر رہا کر دیا گیا۔ جو لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان کا فدیہ یہ مقرر ہوا کہ وہ مدینہ کے دس دس لڑکوں کو پڑھنا سکھا دیں۔ بعض جن کا فدیہ ادا کرنے والا کوئی نہ تھا ان کو بغیر رقم (بطور فدیہ) لئے آزاد کر دیا گیا۔ اور امراء جنھیں فدیہ کی ادائیگی کی استطاعت تھی۔ ان سے مناسب مقدار میں رقم وصول کر کے آزادی دیدی گئی۔[۲]

جتنا عرصہ یہ قیدی مدینہ رہے جنابِ سیّد الانبیاءؐ کے ارشاد کے مطابق ان سے بہترین سلوک روا رکھا جاتا رہا۔ مسلمان اپنی بساط کے مطابق انہیں بہتر سے بہتر کھانا کھلاتے جن کے پاس کپڑے نہ تھے انہیں کپڑے مہیا کر کے دیتے۔

سبحان اللہ! قیدیوں کے ساتھ ایسا حسن سلوک اپنی مثال آپ ہی ہے۔

(۴)

جنگِ اُحد کے دوران اس نازک مرحلہ پر جبکہ مسلمانوں کی فتح، ان کی ذرا سی غفلت و لاپرواہی کی وجہ سے شکست میں تبدیل ہو چکی تھی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے گنتی کے چند صحابہ کے ساتھ لشکرِ کفّار کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دشمنانِ اسلام

---

[۱] تلخیص ۔ دیباچہ تفسیر القرآن انگریزی (مصنفہ حضرت امام جماعتِ احمدیہ) زیر عنوان "سراقہ کا تعاقب اور اسکے متعلق آنحضرتؐ کی ایک پیشگوئی" (ص ۱۴۶)

[۲] تلخیص ۔ دیباچہ تفسیر القرآن انگریزی زیر عنوان "بدر کے قیدی" (ص ۱۵۵-۵۶)

کے تیروں سے آپ کا چہرہ زخمی ہو گیا اور آپؐ کے چند دندانِ مبارک بھی شہید ہو گئے۔ صحابہ کو اس حادثۂ عظیمہ نے بہت رنج اور دکھ پہنچایا۔ انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! آپؐ ان کفار کے لئے بد دعا فرمائیں۔ لیکن آنحضرتؐ نے باوجود اس امر کے کہ ان کے ہاتھوں آپؐ کو بہت تکالیف پہنچی تھیں۔ بڑے ہی آرام و سکون سے فرمایا "میں لوگوں کے خلاف بد دعا کرنے کے لئے تو نہیں بھیجا گیا بلکہ میری بعثت کا اصل مقصد اور اس کی اصل غرض و غایت تو یہ ہے کہ میں ان کے لئے رحمت کی دعا کروں۔ اے خدا! تو میری قوم کے افراد کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کس شخص کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں"

۵

حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ چند یہودی آپ کے پاس آئے اور (بجائے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کے) اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ[1] کہا میں اس کے معنے سمجھ گئی۔ اور میں نے کہا۔ عَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَۃُ۔[2] تو آپؐ نے فرمایا: "ٹھہرو عائشہ! اللہ ہر کام میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا آپؐ نے نہیں سنا ان یہودیوں نے کیا کہا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "میں نے جواب میں کہہ دیا تھا" عَلَیْکُمْ۔ اپنی طرف سے بُرے الفاظ کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی۔[3]

۶

جس سال غزوہ بدر الموعد ہوئی اسی سال مکہ میں خوفناک قحط پڑا۔ قریشِ مکہ اس قحط سے بہت تکلیف میں مبتلا ہو گئے اور غرباء کو تو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کی اس تکلیف کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے از راہِ ہمدردی مکہ کے غرباء کے لئے اپنی طرف سے کچھ چاندی بھیجی اور اس طرح اس بات کا ایک عملی ثبوت پیش کر دیا کہ آپؐ کا دل آپؐ کے سخت ترین دشمنوں کے ساتھ بھی ایک گہری

---

[1] ترجمہ:- تجھ پر موت وارد ہو۔ [2] ترجمہ:- تمہی پر موت وارد ہو اور تمہی پر لعنت پڑے۔

[3] یہ حدیث بخاری میں سے ماخوذ ہے اصل عربی عبارت یوں ہے:- عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کان الیھود یسلمون علی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم یقولون السَّام علیک فقطنت عائشۃ رضی اللہ عنہا الی قولھم فقالت علیکم السَّام واللعنۃ، فقال النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم مھلا یا عائشۃ ان اللہ تعالیٰ یحب الرفق فی الامر کلہ فقالت یا نبی اللہ او لم تسمع مایقولون قال او لم تسمعی اردّ ذٰلک علیھم فاقول وعلیکم۔

(کتاب الدعوات باب الدعا علی المشرکین)

اور حقیقی ہمدردی رکھتا تھا۔[1]

۷

غزوہ بنو مصطلق کے بعد لشکرِ اسلام واپس مدینہ آرہا تھا۔ راستہ میں لشکر نے دوپہر کے وقت آرام کرنا شروع کر دیا۔ ایک درخت کے نیچے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی قیلولہ فرمانے لگے۔ اور اپنی تلوار درخت کے ساتھ لٹکا دی۔ غورث بن حارث نے جو بدّت سے اسی تاک میں تھا کہ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دے۔ اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ وہ آپؐ کے قریب پہنچا۔ درخت سے تلوار اتاری اور آپؐ کو جگا کر کہنے لگا۔ "اے محمدؐ! (صلعم) بتا تجھے میرے ہاتھوں سے کون بچا سکتا ہے؟ اور کوئی شخص ہوتا تو شائد اسی کے پاؤں پر گر پڑتا لیکن آپؐ کی کیا حالت تھی؟ دشمن کو یوں سر پر کھڑے دیکھ کر آپؐ ذرا بھر بھی پریشان نہ ہوئے۔ اور نہ ہی گھبرائے — اس لئے کہ آپؐ کو خدا پر پورا بھروسہ اور توکل تھا کہ وہ آپؐ کو ضائع نہ کرے گا۔ آپؐ نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ "اللہ"۔ اس مختصر سے کلمہ کو آپؐ نے کچھ اس جلالی انداز میں بیان کیا کہ دشمن مرعوب ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ پیدا ہو گئی اور تلوار چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ آپؐ نے فوراً اسے اٹھا لیا اور پھر فرمانے لگے۔ "اب تو بتا کہ تجھے میرے ہاتھوں سے کون بچا سکتا ہے؟" وہ کہنے لگا۔ آپؐ کے سوا اور کون مجھے موت کی گود میں جانے سے بچا سکتا ہے"۔ جناب سرورِ کائنات نے اس سے درگذر کیا۔

حالانکہ اگر چاہتے تو ایک ہی لمحہ میں اس کا کام تمام کر کے رکھ دیتے۔ یہ تھا آپؐ کا اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ سلوک۔

۸

کعب بن زبیر ایک مشہور شاعر تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہجو میں ناپاک اور گندے شعر کہتا۔ اور علانیہ مجلسوں میں سناتا۔ فتح مکّہ پر کہیں روپوش ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد دربارِ نبویؐ میں اجنبی بن کر حاضر ہوا اور عرض کیا۔ کعب امان مانگتا ہے۔ کیا آپؐ اسے معاف کر دیں گے؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے عفو اور درگذر نہایت مرغوب چیز تھی۔ آپؐ نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا۔ کعب میرا ہی نام ہے اور ایک لمبا قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف اس کے سابقہ افعال کو اپنی رحم و شفقت کی چادر کے نیچے ڈھانپ دیا بلکہ اس کے جسم پر بھی چادر ڈال دی۔ کہا جاتا ہے یہ چادر بیس ہزار (۲۰۰۰۰) درہم میں اس کے وارثوں سے حضرت امیر معاویہ نے خریدی اور اس کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس میں ہوتی ہوئی ترکوں کے پاس پہنچی اور اب تک قسطنطنیہ کے خزانہ تبرکات میں موجود ہے۔

۹

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ زید بن سعنہؓ قبولیتِ اسلام سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور اس قرضہ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ جو

---

[1] سیرت خاتم النبیینؐ حصہ دوم۔

آپؐ نے ان سے لیا ہوا تھا۔ انہوں نے آپؐ کے کندھوں اور آپؐ کے دامن سے آپ کا کپڑا بھی کچھ کھینچا اور سخت کلامی بھی کی۔ پھر کہنے لگے "اے عبد المطلب کے بیٹو! تم تو ہمیشہ ٹال مٹول ہی کرتے رہتے ہو۔"

اس پر حضرت عمرؓ نے انہیں ڈانٹا۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مسکراتے رہے اور پھر فرمانے لگے

"اے عمرؓ! تم کو چاہیئے تھا کہ مجھے قرض کی ادائیگی کی طرف اچھے رنگ میں توجہ دلاتے اور اسے (یعنی زید بن سعنہؓ کو) سمجھاتے کہ نرمی سے قرضہ کی واپسی کا تقاضا کرے۔"

پھر آپ فرمانے لگے:۔

"ابھی تو مقررہ میعاد میں سے تین دن باقی ہیں۔"

پھر آپؐ نے حضرت عمرؓ کو ان کا مال واپس کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا:۔

"چونکہ تم نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے اس لئے اسے ۲۰ مد۱؎ غلہ زائد دے دیا جائے۔"

(۱۰)

دعویٰ نبوت کے بعد قیام مکہ کے تقریباً ۱۳ سال مصائب میں گزارنے اور قیام مدینہ کے ۸-۹ سال کفار کے ساتھ جنگ وجدال میں مصروف رہنے کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ایک فاتح کی حیثیت سے "دس ہزار قدوسیوں" کے عظیم الشان لشکر کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے تو مکہ کے تمام سرکش و ظالم کفار جنہوں نے اسلام کو غلط، قرآن کو اساطیر الاولین کا مجموعہ، اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو جادوگر یا مجنون یا جھوٹا مدعی قرار دیا تھا (نعوذ باللہ من ذالک) جنہوں نے اپنے تمام زر و وسائل اسلام کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی ناکام کوشش میں صرف کر دیئے تھے اور جن کی وجہ سے سینکڑوں صحابہ جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ آپؐ کے سامنے ماتحتوں اور ایک شکست خوردہ قوم کی طرح لائے گئے۔ ان کے سر اپنی کی ہوئی بدعمالیوں کے بوجھ کی وجہ سے جھکے ہوئے تھے وہ سمجھتے تھے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ رسول اللہ ہمارے مظالم کا بدلہ، جو ہم نے بے گناہ و بےکس مسلمانوں پر ڈھائے تھے لیں گے۔ اور ہمیں اپنے کئے کی سزا یقیناً ہوگی لیکن ہوا کیا؟ کیا مکہ میں قتل عام شروع ہو گیا؟ لوگوں کی گردنیں اڑائی جانے لگیں؟ نہیں حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو صرف لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔ اِذْھَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ یعنی آج کے دن تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دیگا وہ رحم کرنیوالوں میں سے سب سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے جاؤ تم آزاد ہو۔ فرما کر انکے تمام گناہ بخش دیئے۔

یہ تھا رحمۃ للعالمین کا نمونہ۔ اگر وہ چاہتے تو ایک اشارہ سے تمام ظالم کفار کو ابدی نیند سلا دیتے لیکن طاقت و قوت اور دیگر ہر قسم کی سہولتوں کے میسر ہوتے ہوئے بھی آپؐ نے انہیں معاف کر دیا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ

۱؎ مد غلہ ناپنے کا عربی پیمانہ ہے۔ چار مد مل کر ایک صاع

مخدوم واجد حسیب
ایف۔ ایس سی۔ سال اوّل

آزادیٔ وطن کیلئے مسلمانوں کی جدوجہد

اکبر کی ہندو نواز پالیسی نے مسلمانوں کو جس تاریکی کے گڑھے میں دھکیلا۔ اس کے نتائج بہت دُور رس ثابت ہوئے۔ عام مسلمان جو پہلے ہی علوم دنیوی سے پرہیز کرتے تھے اب اَور بھی بدکنے لگے۔ ہندو جو ایک چالاک اور عقلمند قوم تھی اس نے فوراً اپنے آپ کو منظم کر لیا۔ اور مسلمانوں کو ہر میدان میں شکست دینے لگے۔ اگرچہ اورنگ زیب نے اس کی ہر ممکن تلافی کی مگر بے سود۔ اورنگ زیب کے جانشین نااہل ثابت ہوئے۔ ان سے انگریزوں نے آہستہ آہستہ تمام علاقہ اپنے تصرف میں لے لیا۔

پنجاب میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن ان کی معاشی حالت بہت ہی کمزور تھی۔ پنجابی مسلمان ہمیشہ قرضہ میں ہی آنکھ کھولتا اور مرنے کے بعد صرف قرضہ ہی بطور ورثہ چھوڑ جاتا۔

ہندو ہر ایک شعبہ پر قابض تھے۔ وہ مسلمانوں کی بیوقوفی سے خوب فائدہ اُٹھاتے۔ مذہبی تعلیم کے فقدان کے باعث نت نئی فضول رسمیں رائج ہو رہی تھیں۔ چونکہ ہندوؤں کے ساتھ وہ کافی عرصہ رہ چکے تھے اس لئے ہندو تہذیب نے بہت اثر کیا۔ حتیٰ کہ ان کے تہواروں تک کو منانے لگے۔ مثلاً بسنت و بیساکھی کا میلہ وغیرہ۔ اسی طرح بیاہ شادیوں پر بے تحاشا قرضہ لیکر بے دریغ خرچ کرنے کی رسم ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں پیدا ہو گئی۔

مسلمانوں کی بدقسمتی دیکھئے کہ جہاں انہوں نے ہندوؤں کی ریس کرتے ہوئے ان کی مذہبی رسوم کو اپنے ہاں رواج دیا۔ انھوں نے ان کی تعلیمی حالت سے کوئی سبق نہ لیا۔ وہ علوم دنیوی حاصل کرنے والوں کو کافر و مضلّ کا خطاب دیتے اور انگریزی اور علوم جدیدہ کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے۔ مسلمانوں کے زوال کی داستان ایسی نہ تھی کہ اہل درد کو خون کے آنسو نہ رلواتی۔ ہر زمانہ میں مسلمانوں کی خیرخواہی کے لئے تحریکیں اُٹھتی رہیں اور دیرپا اثر بھی چھوڑے۔ دردمند مسلمانوں کو نہ صرف باہر کے دشمنوں یعنی ہندوؤں اور انگریزوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ ان کو خود جاہل و ناعاقبت اندیش مسلمانوں کو بھی راہِ راست پر لانا پڑتا تھا۔ بعض دردمند مسلمان جو انگریزوں کی غلامی کے جُوئے کو اتارنے کے لئے ہر وقت بے قرار رہتے تھے۔ خود اپنے رفقائے کار کی غداریوں سے نالاں و پریشان رہے۔

فوجی لحاظ سے مسلمانوں کی آزادی کے سب سے بڑے علمبردار سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو تھے۔ سراج الدولہ اٹھارہویں صدی میں بنگال کا صوبیدار ہو گزرا ہے۔ کلائیو کی عیّاری اور چالاکی اور میر جعفر کی غداری کے باعث اس کے ارادے پُورے نہ ہو سکے۔ آخر پلاسی کی جنگ میں

کام آیا۔ اور اس طرح سے خود مسلمانوں نے مسلمانوں کو ختم کر کے اپنی شومئی قسمت پر غلامی کی مُہر ثبت کی۔

شیرِ دکن سُلطان ٹیپو جو آزادی کا متوالا اور مسلمانوں کے لئے ایک دردمند دل رکھنے والا انسان تھا اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے میں نمودار ہوا۔ اور آن کی آن میں سارے دکن پر چھا گیا۔ زلزلے نے اس کو قابو کرنے کے لئے لالچ دینے کا حربہ استعمال کیا۔ مگر اس نے فرنگیوں کی غلامی کے جُوئے کو توڑنے کے لئے اسے نفرت سے ٹھکرا دیا۔ اور جنگ شروع کر دی۔ مگر ہندو دیوان کی غداری اور مسلمانوں کی بے وفائی کی وجہ سے اپنی سنہری بیٹی سمیت فرشِ خاک پر ہمیشہ کے لئے سلا دیا گیا۔

شیرِ دکن کے بعد کسی مسلمان نے عسکری لحاظ سے انگریزوں سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کی۔ مگر اب بھی درد مند انسان موجود تھے چنانچہ انھوں نے جہاد بالسیف کی بجائے جہاد بالقلم شروع کیا۔

اٹھارھویں صدی عقائد کے لحاظ سے فساد کی صدی کہلانے کی مستحق ہے۔ اس صدی میں مسلمانوں کی مذہبی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جب اس دور کے مجددِ وقت حضرت ولی اللہ شاہ صاحب نے قرآن کریم کا ترجمہ فرمایا تو انہیں کافر کے خطاب سے نوازا گیا۔ اور اسلام سے خارج قرار دیا گیا مگر یہ اللہ کا بندہ کب ڈرنے والا تھا۔ بالآخر اپنے مقصدِ تجدید و احیاءِ دین میں کامیاب ہوا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مُردہ دلوں میں آزادی کی خواہش بھر دی آپ کی تحریروں نے آبِ حیات کا کام دیا۔ آپ نے مسلمان قوم کو "الحجۃ البالغہ" سے جھنجوڑتے ہوئے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی پوری کوشش کی۔ اور مسلمانوں کے سیاسی و معاشی تنزل کا سب سے بڑا سبب اسی بات کو قرار دیا کہ اب مسلمانوں نے غیر اسلامی رسوم اپنا لی ہیں اگر وہ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اسلام کے اصولوں کی پیروی کرنی چاہیئے۔ آپ کے روح پرور پیغام سے بہت سے نیک بخت انسان آپ کے ہاں جمع ہو گئے اور آپ کی تعلیمات کے زیرِ اثر انیسویں صدی کے شروع میں ایک فوجی مہم تیار ہوئی۔ جو کہ حضرت سید احمد بریلویؒ کے زیرِ کمان تھی۔ اصل مقصد دہلی کو فتح کرنا تھا۔ مگر پنجاب میں سکھوں کے خلاف لڑائی کرنا ضروری تھا۔ اس لئے حضرت نے جہاد کا آغاز کر دیا۔ پہلے تو کامیابی ہوتی رہی۔ مگر ازاں بعد افغانوں کی غداری سے آپ نے بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مسلمانوں کے دلوں میں اب بھی جہاد کا شوق چٹکیاں لیا کرتا تھا۔ اور وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے پر تُلے ہوئے تھے۔ انگریزوں نے ہندوؤں پر بھی سختیاں شروع کیں تو وہ بھی مسلمانوں سے مل گئے آخر متحدہ محاذ قائم ہو گیا۔ جو کہ ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے بغاوت کے رنگ میں نمودار ہوا۔ اور آنِ واحد میں سارے ہند کو لپیٹ میں لے لیا۔ چونکہ ایک خاص نظام کے تحت تحریک شروع نہ کی گئی تھی۔ اس لئے یہ ناکامی پر منتج ہوئی۔

غدر کے اختتام پر سارا بوجھ مسلمانوں پر آ رہا۔

کام آیا۔ اور اس طرح سے خود مسلمانوں نے مسلمانوں کو ختم کر کے اپنی شومئی قسمت پر غلامی کی مہر ثبت کی۔

شیرِ دکن سلطان ٹیپو جو آزادی کا متوالا اور مسلمانوں کے لئے ایک دردمند دل رکھنے والا انسان تھا اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے میں نمودار ہوا۔ اور آن کی آن میں سارے دکن پر چھا گیا۔ ولزلے نے اس کو قابو کرنے کے لئے لالچ دینے کا حربہ استعمال کیا۔ مگر اس نے فرنگیوں کی غلامی کے جوئے کو توڑنے کے لئے اسے نفرت سے ٹھکرا دیا۔ اور جنگ شروع کر دی۔ مگر ہندو دیوان کی غداری اور مسلمانوں کی بے وفائی کی وجہ سے اپنی سنہری بیٹی سمیت فرشِ خاک پر ہمیشہ کے لئے سلا دیا گیا۔

شیرِ دکن کے بعد کسی مسلمان نے عسکری لحاظ سے انگریزوں سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کی۔ مگر اب بھی دردمند انسان موجود تھے چنانچہ انھوں نے جہاد بالسیف کی بجائے جہاد بالقلم شروع کیا۔

اٹھارھویں صدی عقائد کے لحاظ سے فساد کی صدی کہلانے کی مستحق ہے۔ اس صدی میں مسلمانوں کی مذہبی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جب اس دور کے مجددِ وقت حضرت ولی اللہ شاہ صاحب نے قرآن کریم کا ترجمہ فرمایا تو انہیں کافر کے خطاب سے نوازا گیا۔ اور اسلام سے خارج قرار دیا گیا مگر یہ اللہ کا بندہ کب ڈرنے والا تھا۔ بالآخر اپنے مقصدِ تجدید و احیاءِ دین میں کامیاب ہوا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مُردہ دلوں میں آزادی کی خواہش بھر دی آپ کی تحریروں نے آبِ حیات کا کام دیا۔ آپ نے مسلمان قوم کو "الحجۃ البالغہ" سے جھنجوڑتے ہوئے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی پوری کوشش کی۔ اور مسلمانوں کے سیاسی و معاشی تنزل کا سب سے بڑا سبب اسی بات کو قرار دیا کہ اب مسلمانوں نے غیر اسلامی رسوم اپنا لی ہیں اگر وہ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اسلام کے اصولوں کی پیروی کرنی چاہیئے۔ آپ کے روح پرور پیغام سے بہت سے نیک بخت انسان آپ کے ہاں جمع ہو گئے اور آپ کی تعلیمات کے زیرِ اثر انیسویں صدی کے شروع میں ایک فوجی مہم تیار ہوئی۔ جو کہ حضرت سید احمد بریلویؒ کے زیرِ کمان تھی۔ اصل مقصد دہلی کو فتح کرنا تھا۔ مگر پنجاب میں سکھوں کے خلاف لڑائی کرنا ضروری تھا۔ اس لئے حضرت نے جہاد کا آغاز کر دیا۔ پہلے تو کامیابی ہوتی رہی۔ مگر ازاں بعد افغانوں کی غداری سے آپ نے بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مسلمانوں کے دلوں میں اب بھی جہاد کا شوق چٹکیاں لیا کرتا تھا۔ اور وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے پر تُلے ہوئے تھے۔ انگریزوں نے ہندوؤں پر بھی سختیاں شروع کیں تو وہ بھی مسلمانوں سے مل گئے آخر متحدہ محاذ قائم ہو گیا۔ جو بکدم ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے بغاوت کے رنگ میں نمودار ہوا۔ اور آنِ واحد میں سارے ہند کو لپیٹ میں لے لیا۔ چونکہ ایک خاص نظام کے تحت تحریک شروع نہ کی گئی تھی۔ اس لئے یہ ناکامی پر منتج ہوئی۔

غدر کے اختتام پر سارا بوجھ مسلمانوں پر آ رہا۔

مسلمانوں کو تباہی سے بچانے کے لئے سرسید احمد خان میدانِ سیاست میں آئے اور آپ نے مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی بدظنیوں کو ختم کیا اور مسلمانوں کو انگریزی اور دوسرے علومِ جدیدہ میں مہارت پیدا کرنے کا مشورہ دیا۔ علماء کرام اور دوسرے مسلمانوں نے آپ کی سخت مخالفت کی اور کافر وغیرہ کے خطاب دیئے مگر آپ اپنے ارادے میں مستقل رہے اور یہانتک خلوص سے کام کیا کہ جب آپ کے گلے میں پرانے جوتوں کا ہار بھی پہنایا گیا تو آپ نے ان کو بیچکر وصول شدہ رقم ہار پہنانے والے کی طرف سے بطور چندہ لکھ لی۔ اس تعلیمی جدوجہد میں ہی آپ نے علی گڑھ میں ایک سکول قائم کیا۔ جس نے بعد میں کالج اور یونیورسٹی کی صورت اختیار کی۔

یہ آپ کی محنت اور خلوص کا ہی نتیجہ تھا۔ بہت سے مسلمان جن کے دل میں خدمتِ ملت کا جذبہ جھنکیاں لے رہا تھا جلد ہی میدانِ عمل میں کود پڑے۔ مثلاً مولانا حالی۔ نواب محسن الملک اور علامہ اقبال وغیرہ۔ اس کے جلد بعد ہی جب ہندوستان میں آزادی کے حصول کے لئے کانگریس جماعت کھڑی ہوئی تو مسلمان جو آزادی کے پروانے تھے جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے۔ کانگریس میں شامل ہو کر مسلمانوں نے آزادی کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ مگر ہندوؤں نے مسلمانوں کے اس خلوص کو سادہ لوحی پر محمول کیا اور ہندوستان میں ہندو راج کے منصوبے باندھنے شروع کئے۔ آخر ان کے خفیہ منصوبے طشت از بام ہونے شروع ہوئے اس لئے ہندوؤں سے بدظن ہو کر چند دور رس مسلمانوں نے مسلم لیگ قائم کی۔ رفتہ رفتہ کانگریس کے مسلمانوں کے خلاف بُرے منصوبوں سے آگاہ ہو کر مسلمان کانگریس سے مسلم لیگ کی طرف آنے لگے۔ چنانچہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی دوربین اور جہاندیدہ نگاہوں نے کانگریس کے پوشیدہ عزائم کو بھانپ لیا۔ اور ہندو مسلم اتحاد کا پیغمبر ہندوؤں کے خفیہ ارادوں سے آگاہ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔

اب ہندوؤں نے مسلمانوں کو واپس لانے کے لئے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کر دیں جس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فسادات نے جنم لیا۔ اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے دور سے دور تر چلے گئے اس کے بعد گاندھی جی نے اتحاد کی کوشش کی مگر ناکام ہوئے کئی اتحاد کمیٹیاں بنیں مگر بے اثر۔ اسی طرح راؤنڈ ٹیبل کانفرنسیں بھی اس معاملہ میں ناکام ثابت ہوئیں۔

اب ہندوؤں نے ہندو راج کے منصوبے کو اور بھی پختہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ نہرو رپورٹ کے وقت ہندوؤں کی ذہنیت مسلمانوں پر بالکل واضح ہو گئی۔ چنانچہ تقریباً تمام مسلمان کانگریس سے الگ ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا اس کو عملی رنگ دینے کے لئے مسلم لیگ نے "قراردادِ پاکستان" کے نام سے ایک قرارداد پاس کی جس میں پاکستان کے قیام کا مطالبہ تھا۔ ہندوؤں نے اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اس کو "شاعر کا تصور" اور "طفلانہ خواب" سے تعبیر کیا۔ لیکن قائداعظم جیسے مستقل مزاج

آدمی نے ان کی ان فضول باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔

اگرچہ تقسیم ہند کا خیال کوئی نیا نہ تھا کیونکہ اس سے قبل ہندو لیڈر لالہ لاجپت رائے اور رام موہن رائے بھی اس خیال کا اظہار کر چکے تھے۔ مگر اب جب قائداعظم نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تو ہندوؤں نے اس طرح ... اپنے ارادے کے منصوبوں کو خاک میں ملتے دیکھ کر واویلا شروع کیا اور اس خیال کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن قائداعظم اپنے ارادے میں چٹان سے بھی زیادہ سختی سے ڈٹے رہے اور اس پیکر ہمت و استقلال نے سخت ترین مشکلات میں بھی دامن استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اور پاکستان کے قیام کے لئے کوششیں جاری رکھیں۔ آخرکار آپ کی دن رات کی کوشش بر آئی اور جون ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا اعلان گورنمنٹ کی طرف سے کر دیا گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعۃ الوداع مکمل اختیارات کے ساتھ پاکستان کی نئی مملکت خداداد معرض وجود میں آئی۔ اور قائداعظم محمد علی جناح اس سب سے بڑی اسلامی اور دنیا کی پانچویں بڑی سلطنت کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

"پاکستان پائندہ باد"

امتیازی نشان

"یہاں کوئی ایسا طریق برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ جو دین کے خلاف اور مذہبی روایات کے منافی ہو۔ ہم نے یہ کالج دین کی تائید کے لئے بنایا ہے۔ اگر کسی وقت یہ محسوس ہو کہ یہ کالج بجائے دین کی تائید کرنے کے بے دینی کا ایک ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔ تو ہم ہزار گنا یہ زیادہ بہتر سمجھیں گے کہ اس کالج کو بند کر دیں بجائے اس کے کہ بے دینی اور خلاف مذہب حرکات کو برداشت کریں۔ ...... صداقت کو قبول کرنے میں برکت ہے اور صداقت کو قبول کرنے سے ہی قومی ترقی ہوتی ہے۔ یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہمارا طریق سارے کا سارا اسلامی ہونا چاہیئے۔ بیشک ہندو، سکھ، عیسائی جو بھی آئیں۔ ہمیں فراخ دلی کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ مگر جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ ان کے اخلاق سراسر مذہب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں ...... دوسروں کے لئے مذہبی لحاظ سے وہ ایک مثال اور نمونہ ہوں۔۔۔ جہاں تک توحید کے قیام کا سوال ہے جہاں تک مذہب کی عظمت کا سوال ہے جہاں تک خدا تعالے کی محبت کا سوال ہے مسلمان۔ ہندو۔ سکھ۔ عیسائی سب اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ انکو یہ تعلیم دی جائے۔ کیونکہ انکا اپنا مذہب بھی یہی باتیں سکھاتا ہے میرے نزدیک ہمیں ان باتوں پر اسقدر زور دینا چاہیئے کہ ہمارے کالج کا یہ ایک امتیازی نشان بن جائے کہ یہاں سے جو طالب علم بھی پڑھ کر نکلتا ہے وہ ۴۴

۴۴ خدا پر پورا یقین رکھتا ہے ... اخلاق کی حفاظت کرتا ہے وہ مذہب کی عظمت کا قائل ہوتا ہے۔" (تقریر حضرت امام جماعت احمدیہ

بموقع افتتاح تعلیم الاسلام کالج ۔ ۴ جون ۱۹۴۴ء [illegible] ۱۹۴۴ء [illegible])

عابد علی عابد
الیف ایس سی۔ سال دوم

علم کا غلط استعمال

کسی چیز کے خصائل کے متعلق ظاہری یا پوشیدہ اور اندرونی یا بیرونی معرفت کو "علم" کہتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص یہ جانتا ہے کہ بجلی کس طرح پیدا ہوئی۔ اس کا عمل اور ردِ عمل کیا ہے۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص بجلی کے مظاہر کا علم رکھتا ہے۔

علم اپنی ذات میں بہت مفید اور کارآمد چیز ہے علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اپنے خالق و مالک کے رازوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ کسی راز کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اس کائنات کی تخلیق کی۔ تب اس کے دل میں ایک جلا اور روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے رب کا ایک شکر گزار عبد بن جاتا ہے۔ اور اپنے علم کو احسن الخالقین اور ارحم الراحمین کی رضا جوئی کے لئے وقف کر دیتا ہے وہ علم کی نعمت کو کبھی غلط طور سے استعمال نہیں کرتا مبادا اللہ تعالےٰ کا نافرمان اور ناشکر گزار ٹھہرے۔

تاہم دنیا میں بعض ایسے بھی انسان ہیں جو اللہ تعالےٰ کی اس نعمت کی قدر نہیں کرتے۔ جس کے ذریعہ سے وہ اپنی اور اپنے خالق کی ہستی پہچاننے کے قابل ہوئے۔

علم کی دو بڑی شاخیں ہیں یعنی دینی علم اور دنیوی علم۔ دینی علم کا تعلق زیادہ تر ہمارے مذہب اور معاشرہ سے ہوتا ہے۔ جبکہ دنیوی علوم اگرچہ بالواسطہ مذہب اور معاشرہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کا براہِ راست تعلق ہمارے جسم کی آسائش اور اس کی سہولت اور آرام سے ہے۔

اب میں قارئین کو بتاتا ہوں کہ کس طرح علم کی ان ہر دو اقسام کو ایسے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ کہ جس سے بنی نوع انسان کی تکالیف میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ہر انسانی دماغ ایک ہی لائن پر نہیں سوچتا لہٰذا ضروری نہیں کہ ہر شخص جو ایک ہی قسم کا علم حاصل کرے اسے ایک ہی طریق سے استعمال کرے۔ آجکل ہمارا یہ مشاہدہ عام ہو چکا ہے کہ دین کے عالم کہلانے والے لوگ از قسم مولویان و پادریان وغیرہ خلق اللہ کے درمیان فساد کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ناحق اپنے آپ کو عالم کہتے ہیں کیونکہ عالم ایسے کام نہیں کرتا جس سے باہمی جھگڑا فساد پیدا ہو۔ عالم وسیع ظرف اور اعلیٰ حوصلہ ہوتا ہے اور وہ اختلاف کو جھگڑا کرنے کی بنیاد نہیں بناتا بلکہ وہ اختلاف کو

بھی رحمت سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ اگر اختلاف کا وجود نہ ہوتا تو عقلی اور فکری قوتوں پر جمود طاری ہو جاتا۔ اور انسانیت اپنے بامِ عروج تک نہ پہنچ سکتی۔ پس کس قدر ناشکرے ہیں نیم ملّا قسم کے لوگ جو "اختلاف" کی بنیاد پر دنگا فساد کھڑا کر دیتے ہیں۔ اے کاش! وہ اہلِ عالم سمجھیں کہ کسی اختلاف کی بناء پر قتل و غارت کا برپا کرنا علم کی خدمت نہیں بلکہ علم کی رُوح پر ظلم ہے

علم کی دوسری قسم یعنی دنیوی علم میں بھی ان علوم کے علماء نے ایسے جراثیم داخل کر دیئے ہیں کہ جس سے تمام انسانیت ہر آن خطرہ سے دوچار ہے۔ وہ کسی وقت بھی ختم کی جا سکتی ہے۔ وہ علوم جن کا مقصد انسانی جسم کو سکون اور راحت عطا کرنا تھا۔ آج انہیں علوم کی مدد سے انسان کی تباہی اور بربادی کے منصوبے تیار کئے جاتے ہیں کتنی بڑی ناشکری ہے رحمٰن خدا کی اگر یہ لوگ حقیقی عالم ہوتے اور ان کے دلوں میں خدا کا خوف اور اس کی نعمتوں کی شکرگذاری کا جذبہ ہوتا تو وہ ان علوم کو ہرگز ہرگز غلط طریق سے استعمال نہ کرتے۔

آج جب ایک شخص اپنے والدین کی نسبت کچھ زیادہ علم حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس نعمت کو تکبّر اور نخوت کے حصُول میں صرف کر دیتا ہے وہ اپنے والدین کی باتوں کو کوئی اہمیّت نہیں دیتا اور علم کا گھمنڈ ہر وقت اس کے دماغ میں ابابیلوں کی طرح چکر لگاتا رہتا ہے۔ آج کل کی نئی روشنی کی تعلیم تو بالخصوص بچّوں میں غلط آزاد فکری پیدا کر رہی ہے۔

پھر سائنسی علوم کے ناخدا ہیں۔ وہ بھی علم کے اصل مقصد سے دُور جا کر علم کو اس طور سے استعمال کر رہے ہیں کہ جس سے انسانیت کو بحیثیت مجموعی کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ سائنسدان خدا کے شکرگذار ہونے کی بجائے شیطان کے آلۂ کار بن گئے ہیں اور آج انہوں نے ایسی ایسی ایجادات کر دی ہیں کہ ان کے ذریعہ پل بھر میں عالمِ انسانیت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ آج کا سائنسدان انسانیت کی بقا کے لئے نہیں بلکہ فنا کے لئے کام کر رہا ہے میرے نزدیک ایسا سائنسدان حقیقی سائنسدان نہیں کہلا سکتا کیونکہ وہ تاریک پہلو پر نظر رکھتا ہے۔

فسادی عالم، خواہ دینی علم کا ہو یا دنیوی علم کا، شجرِ انسانیت کی ایسی ٹہنی ہے کہ جسے تخریب کا کیڑا لگ چکا ہو۔ ایسی ٹہنی کا جلد علاج کرنا چاہیئے ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ

"نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملّا خطرۂ ایمان"

عادات کا تسلّط

آپ کالج کے زمانہ کو ایک مقفّل صندوق کی طرح آئندہ زندگی سے علیحدہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ جو عادتیں آپ یہاں ڈالیں گے وہ منتقل ہیں آپ سے علیحدہ نہیں ہوں گی یہ برفانی پہاڑوں کی ندی ہے جو آپکے منبع جاری ہے یہ بھی غلط ہے کہ آپکو اچھا کاروبار مل گیا تو عادتیں خود بخود اچھی ہو جائیں گی۔ اتنا ضرور ہوگا کہ آپکے عیب دولت سے چھپ جائیں گے چنانچہ ایک بزرگ نے کہا ہے کہ دولت خدا تو نہیں مگر بخلاف وہ خدا کی طرح ستّار العیوب و رقاضی الحاجات ہے۔ (رسالہ سید نصیر احمد) اقتباس از خطبہ صدارت چیف جسٹس ایم آر کیانی مرحوم بموقع جلسہ تقسیم اسناد

محمود احمد دبیش
ایف۔ ایس سی (سال اوّل)

رستے ناسُور!

۱

اَلکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ (ارشادِ نبویؐ)

ہمارے گاؤں میں ایک ایسا گھر ہے جس کے رہنے والوں کا آبائی پیشہ گداگری ہے۔ اس گھر کا مالک (جس کا ایک ہاتھ بیماری کی وجہ سے ٹیڑھا ہو چکا ہے) گوجرانوالہ۔ لائلپور۔ لاہور بلکہ کراچی تک گداگری کرنے چلا جاتا ہے۔ ایک دن اسے ایک ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ "اگر تم اپنے ہاتھ کا علاج معالجہ کراؤ۔ تو بالکل ٹھیک ہو سکتا ہے اور پیسے بھی بہت کم لگیں گے" اس پر اس فقیر نے جو جواب دیا ملاحظہ فرمائیں "چھڈو ڈاکٹر جی۔ میں تے ہر مہینے اپنی تنخواہ ایہو ہتھ دکھا کے بنا لینداں آں جتنی اک ڈپٹی کمشنر دی وی نہیں ہندی اے۔ ہتھ ٹھیک کروا کے ایس آمدنی توں وی ہتھ دھو بہواں" (یعنی چھوڑیئے ڈاکٹر صاحب۔ میں تو ہر ماہ بھیک مانگ کر اتنی آمدنی جمع کر لیتا ہوں، جتنی ایک ڈپٹی کمشنر بھی نہیں لے سکتا۔ میں ہاتھ ٹھیک کروا کر اپنی آمدنی سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا۔ یہی ہاتھ دکھا کر میں کچھ وصول کرتا ہوں)

میں جب بھی اس کا یہ فقرہ یاد کرتا ہوں تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ محنت کرنے والا خدا تعالےٰ کو پیارا ہوتا ہے۔ مگر کتنے افراد ہیں جو آج محنت سے جی چرا کر اس حدیث سے انکار کر رہے ہیں۔ اور خدا تعالےٰ کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔ جس قوم کے اتنے افراد مانگ کر گذارہ کر رہے ہوں کہ ان سے سڑکوں کی سڑکیں بھری پڑی ہوں تو وہ قوم کیا خاک ترقی کرے گی؟ پیغمبرِ اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم چودہ سو سال پیشتر جو کچھ فرما گئے یاجوج ماجوج کی قومیں اسے اپنا کر ترقی کے مدارجِ اعلیٰ تک جا پہنچی ہیں۔ مگر افسوس خود مسلمان اس قول سے بالکل غافل ہیں۔ قارئین کرام غور فرمائیں کہ کس طرح اسلامی ممالک پسماندگی کا قلع قمع کریں جبکہ لاتعداد افراد گداگری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور اَلکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ کی پیاری حدیث کے منکر ہو رہے ہیں آج اسلامی ممالک میں ان "منگتوں" کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ شاید ہی کسی یورپین ملک میں ہو۔ خدا تعالےٰ اپنا فضل فرمائے ؛

۲

ہمدردی

گذشتہ سال کا ذکر ہے میں شہر کی جانب سائیکل

پر سوار جا رہا تھا۔ ابھی بازار کو جانے والے چوک سے چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ "سیٹی" بجی پلٹ کر ایک طرف دیکھا تو ڈیوٹی پر کھڑا سپاہی مجھے بلا رہا تھا میں اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے میرا نام و پتہ پوچھ کر ایک سفید کاغذ پر لکھ لیا۔ اور کہنے لگا کہ اس پر دستخط کر دو۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ کہ وہ بورڈ تو دیکھو۔ مجھے پتہ نہیں تھا کیونکہ اس سڑک پر نیا نیا "یک طرفہ ٹریفک" کا بورڈ لگا تھا۔ میں نے بہتیرا کہا کہ مجھے علم نہیں تھا مگر وہ کب ماننے والا تھا۔ اسی دوران ایک بڑی اماں بھی تشریف لے آئیں۔ اور آتے ہی کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ اور مجھے ذرا تھوڑی دور لے جا کر کہنے لگیں کہ کیا بات ہے۔ میں نے اپنی مظلومی کا رونا رو دیا۔ کہنے لگیں "دیکھو مجھے تم سے ہمدردی ہے تم سے پہلے بھی کئی بیچارے پھنس چکے ہیں اور یہ سپاہی کسی کو نہیں چھوڑتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس روپیہ ڈیڑھ روپیہ ہے تو مجھے دے کر چلے جاؤ ورنہ چالان ہو جائے گا۔ تم اسی طرح اب جان چھڑا سکتے ہو"

مجھے پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔ مجبوراً "بقول بڑی اماں کے" جان چھڑانی پڑی۔ یہ واقعہ اب تک میرے ذہن پر ثبت ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میں اب بھی سوچتا ہوں کہ اگر "اس قسم کے ہمدرد (بالفاظ دیگر ایجنٹ ہمدرد) قانون شکنی کے نہ صرف خود مرتکب ہوں بلکہ دوسروں کو بھی آمادہ کرنے لگیں تو پھر تو قانون اور اس کے محافظوں کا خدا حافظ۔

۳

وسیلہ

ایک پیر صاحب کبھی کبھار ہمارے گاؤں میں آیا کرتے ہیں۔ اور ایک پہلے ہی مستقلاً گاؤں میں رہائش پذیر ہیں۔ مگر بقول "شخصے" گھر کا جوگی جوگڑا باہر کا جوگی سدھ"۔ لوگوں نے نئے پیر صاحب کا "کھلے ہاتھوں" استقبال کیا۔ اب ان پیر صاحب کی مجلس ملاحظہ فرمائیں کہ سوائے بے مغز باتوں اور حقے کے دور کے کچھ نہیں ہوتا۔ مسجد میں جا کر با جماعت نماز ادا کرنا تو کجا رہا خود جس گھر میں مجلس لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں وہیں نماز اکیلے پڑھ لیتے ہیں اور آج تک بھی اپنے مریدوں کو نہیں کہا کہ تم بھی میرے ساتھ نماز پڑھو۔ اور اکثر مرید بے نماز ہیں۔ لوگوں کو تعویذ اور گنڈے کے چکر میں خوب پھنسا رکھا ہے۔ ان دونوں پیروں کی آپس میں خوب "کھینچا" تانی ہے اپنے اپنے حلقے کے مریدوں کو دوسرے پیر کے مریدوں سے میل جول سے منع کیا جاتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ ایک ہی دین اسلام کے یہ علمبردار کیوں اتفاق سے ایک جگہ بیٹھ کر اصلاح معاشرہ کے لئے کچھ نہیں سوچ سکتے۔ خیر آمدم برسرِ مطلب۔

ایک دن میں نے ان کے ایک عقیدتمند سے پوچھا کہ یہ تباؤ تمہیں کچھ حاصل بھی ہوتا ہے۔ کہنے لگا

کہ جتنی امیدیں تھیں سب پوری ہو چکی ہیں وخدا جانے اسکی اُمید کیا تھیں؟) پھر میں نے پوچھا کہ تم پیر صاحب کو کیا سمجھتے ہو؟ کہنے لگا کہ وہ ہمارے مرشد ہیں۔ ہماری رہنمائی کرتے ہیں میں نے کہا کہ بتاؤ جب تم خود نماز نہیں پڑھتے تو پھر کس طرح بخشے جاؤ گے کہنے لگا وہ بخشوالیں گے اسی لئے تو مرشد پکڑا ہے۔ میں نے کہا۔ کہ تم نماز پڑھا کرو اور خدا تعالےٰ سے دُعا مانگا کرو۔ تو خدا تعالیٰ خود رحیم و کریم ہے۔ وہ بخش دے گا۔ وہ یہ بات سُن کر کہنے لگا کہ ہم نے تو بطور "وسیلہ" انہیں مُرشد چُنا ہے میں نے پوچھا کیسا وسیلہ؟ کہنے لگا کہ دیکھو تم مکان تو بنا لیتے ہو۔ مگر اس پر چڑھ نہیں سکتے جب تک کہ کوئی وسیلہ یعنی سیڑھی نہ ہو۔ اسی طرح ہمارا مرشد ہے ہم خدا تعالےٰ کو بغیر مرشد یا وسیلہ کے نہیں پا سکتے۔ میں نے باوجودیکہ لاکھ سمجھایا کہ دیکھو خدا تعالےٰ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس لحاظ سے جب بھی اس کا بندہ اُسے پکارتا ہے تو وہ اپنے بندے کی پکار کو سنتا ہے۔ اور اس کی تکالیف کو رفع کرتا اور آرزوؤں کو پورا کرتا ہے۔ مگر باوجود اس گفتگو کے وہ اپنی وسیلہ والی بات پر سختی سے ڈٹا رہا۔

افسوس کہ لوگ قرآن کریم پر غور نہیں کرتے اور سہل انگاری کو نہیں چھوڑتے۔ مگر ان پیروں پر جنہوں نے اپنے زیر اثر عقیدت مندوں کو صراط مستقیم پر لانے کی بجائے "وسیلہ" جیسے موہوم اور شرک سے بھر پور چکر میں پھنسا کر اپنی روٹی کا سامان بنا رکھا ہے، جاہل عقیدت مندوں سے بھی زیادہ افسوس ہے۔

اللہ تعالےٰ ہماری قوم پر اپنا رحم فرمائے۔ وَ هُوَ ارحم الرّاحمین ؎

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

بقیہ ادب اور بنیادی انسانی اقدار

میں گونجتی ہے۔ وہ رو رہا ہے اور اس کی روتی ہوئی آواز "خوابیدہ زمین" اور "یخ بستہ دل" کو جھنجوڑنے میں کوشاں ہے۔ شاعر زمین اور دل دونوں کو صبح کی خوشخبری دے رہا ہے اور کہتا ہے کہ ستارے اور سمندر تیری میراث ہیں جب تک کہ صبح نہیں آتی۔ یہ فقرہ صبح کی اشارت کو مابعد الطبیعیات میں پھیلا دیتا ہے۔ اور کبھی ہم اسے فردوس کی علامت سمجھتے ہیں۔ اور کبھی خوشی کے زمانے کی علامت کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ستارے اور سمندر تب تک زمین کی میراث ہیں جب تک "صبح" دل میں ظاہر نہیں ہوتی۔ شاعر اس اشارے کے ساتھ زمین کی حاکمیت اس انسان کا حق سمجھتا ہے جس کا دل روشنی اور اجالے سے ہمیشہ معمور ہے۔

★ ★ ★

میں کشفِ حقیقت کے مسئلے کو اس مثال سے بہتر پیش نہیں کر سکتا تھا۔ شاعری انسانی اقدار کو جب تک کشف کی صورت نہیں دیتی۔ تب تک وہ اس مقصد کو بروئے کار نہیں لا سکتی جس مقصد کے لئے انسان نے شاعری کے فن کو دریافت کیا ہے۔

جیلانی کامران
ایم۔ اے آنرز

ادب اور بنیادی انسانی اقدار

(۲)

جن بنیادی قدروں یعنی آزادی، نیکی اور روشنی کی قدروں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے ذریعے ایسی قومیتوں کی فکری تاریخ مرتب ہوتی ہے جو عرصہ ہوا یورپی قوموں کے سیاسی تسلط سے آزاد ہوئی ہیں۔ اس سے مطلب یہ نہیں کہ جب وہ یورپی اقوام کے زیر نگیں تھیں اس وقت وہ بنیادی اقدار سے بے بہرہ اور ناواقف تھیں لیکن اس وقت ان کی بنیادی اقدار محکومی کے تاریخی حادثے کے باعث بے کار ثابت ہو چکی تھیں۔ وہ احساسِ وجود، جو غلامی اور محکومی سے رہائی حاصل کر کے دستیاب ہوتا ہے اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھا۔ قومی سطح پر سیاسی آزادی جس احساسِ وجود کو پیدا کرتی ہے وہ نیکی اور روشنی کی قدروں کے ساتھ مل کر مستقبل کو پیدا کرتا ہے مجھے ان باتوں کو دہرانے کی اس لئے ضرورت پڑی ہے کیونکہ ادب کی جو شکل اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ بنیادی انسانی اقدار کی نفی کرتی ہے۔ اور ایک ایسی شاعری کی حمایت اور تقلید کرتی ہے جو محکومی اور غلامی کے زمانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اور جس میں احساسِ وجود ناپید تھا۔ حالات ہی نے کچھ اس طرح کروٹ لی ہے کہ ہماری ادبی روایت سمجھنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ مذہبی اور اخلاقی اقدار، جن پر انسانی زندگی کی صحت کا دارومدار ہے ایک ایسی رائے عامہ کے نزدیک مشکوک ہو چکی ہیں جو غیر مذہبی اور سیکولر حالات میں اقدار کو فالتو اور غیر ضروری سمجھتی ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اقدار پہلے سے موجود نہیں ہیں البتہ جو شے موجود ہے وہ حالات کی حرکت ہے ہر آدمی حالات کی حرکت اور رفتار پر اثر انداز ہونے سے اپنے لئے فائدے کی قدر فراہم کرتا ہے اور چونکہ یہ صورتِ حال باہمی پیکار کی صورتِ حال ہے اس لئے ایک آدمی کا فائدہ ایک ہزار آدمیوں کے نقصان کو پیدا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں آزادی، نیکی اور روشنی کی بنیادی انسانی اقدار جن نتائج کو پیدا کرتی ہیں وہ اندھیرے برائی اور نفسیاتی بحران سے مل کر بنتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بنیادی انسانی اقدار ان حالات میں ناکارہ ثابت ہوتی ہیں ـــ ان حالات میں رائے عامہ کو از سرِ نو مرتب کرنے کے لئے ادب اور بنیادی انسانی اقدار کے باہمی رشتے کو دوبارہ قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اقدار کو جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ادب میں کیسے استعمال کیا جائے۔ میں اس مسئلے کو شاعری کے ضمن میں زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس امر کی جانچ کی

جاسکے۔ کہ یہ اقدار شاعری میں کیسے سموئی جاسکتی ہیں۔ اقدار اور شاعری کا سارا مسئلہ شاعر کے زاویہ نگاہ سے مرتب ہوتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ میں کیا تبدیلی ممکن ہوسکتی ہے اور زاویہ نگاہ کو اقدار کے ساتھ کس طرح نئے طریق سے منسلک کیا جاسکتا ہے ایسی باتیں ہیں جن سے وہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے جو اقدار اور ادب کے باہمی رشتے سے متعلق ہیں وہ شاعری جسے اس وقت اردو ادب کی روایت شمار کیا جاتا ہے ایک خاص طرز کے نکتہ نظر میں اتنی گھر چکی ہے کہ کسی دوسرے نقطۂ نظر کو اپنا نہیں سکتی۔ اس لئے اس سے ان اقدار کے بارے میں کوئی مدد نہیں لی جاسکتی۔ جن کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے لہٰذا سب سے پہلا کام نقطۂ نظر کی تبدیلی کا ہے تاکہ اس تبدیلی کے ذریعے بنیادی انسانی اقدار کو شعری قالب دیا جاسکے۔

آزادی، نیکی اور روشنی کی اقدار میں سے وہ قدریں (آزادی اور روشنی) ایسی ہیں جنہیں انسانی بچپن سے موسوم اور منسوب کیا جاسکتا ہے اور ان کے لئے "بچے" کی علامت تخلیق کی جاسکتی ہے 'بچہ' زندگی کو تحیر اور جاننے کی خواہش کے مختلف طریقوں سے پہچانتا ہے۔ اور اُن بیرونی اور اندرونی قیود سے آزاد ہوتا ہے جو ایک بڑی عمر کے انسان کے لئے نہایت صبر آزما ہوتی ہیں اس صورت میں جسے میں نے آزادی اور روشنی کی اقدار کہا ہے وہ بچے کی علامت کے ذریعے بیان کی جاسکتی ہیں — جہاں تک تیسری قدر "نیکی" کا مسئلہ ہے یہ قدر ان بہت سی قدروں کی نفی سے پیدا ہوتی ہے جو برائی جسم کی غلامی اور حاضر و موجود کی عبادت پر یقین رکھتی ہیں۔ نیکی کی قدر کو 'بچے' کی علامت میں جذب نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ "نیکی" شعوری چناؤ اور رد و قبول سے مل کر ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں 'بچے' کی علامت کو ایک ایسے پس منظر میں پیش کرنا لازمی ہے۔ جہاں نظم کے اجزاء حاضر و موجود کی نفی کرتے ہوئے کسی ایسے غیر واضح اصول کی طرف اشارہ کریں جسے نیکی کی قدر سے منسوب کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں 'بچے' کی علامت پر میں پھر اصرار کرتا ہوں کیونکہ صرف 'بچے' کا علامتی نقطۂ نظر ہی ایک ایسا مذہبی نقطۂ نظر ہے جو پہلے سے بتائے ہوئے روایتی زاویوں سے مختلف ہے زندگی کا وہ نقشہ جو بچے کی علامتی مدد سے مرتب ہوگا۔ نہ صرف ہمیں زندگی کے خوبصورت ہونے کا یقین دلائے گا۔ بلکہ ہماری آنکھوں سے دیکھی بھالی شناسائیوں کا پردہ بھی اتار دے گا۔ اس زمانے میں بنیادی انسانی اقدار صرف 'بچے' کی علامت ہی سے ظاہر اور آشکارا ہوسکتی ہیں۔ بچے کی علامت کا جواز تاریخی طور پر بھی درست ہے کیونکہ وہ قومیں جو سیاسی محکومی کے دور سے باہر نکلنے کے بعد قومی احساسِ وجود کی تلاش کر رہی ہیں حقیقت میں اپنے ماضی کی بجائے اپنا مستقبل ڈھونڈ رہی ہیں اور مستقبل کی پیش کش کبھی واضح نہیں ہوتی۔ اگر ہم مستقبل کی شعری پیشکش کے لئے پچھلی نسل کے شاعروں کے پاس جائیں تو وہ ہمیں جرم و سزا کی قسم کا کوئی مستقبل دکھاتے ہیں۔ اگر ہم ان کے پاس جائیں جن کے دلوں میں وقت نے

کانٹے لگا رکھے ہیں تو وہ جس مستقبل کا ہمیں چہرہ دکھائینگے
دل ہمیں خودکشی پر آمادہ کرے گا۔ اگر ہم سڑکوں پر گذرتے
ہوئے لوگوں سے پوچھیں تو وہ مستقبل کے بارے میں
کہیں گے ہمیں اس نام کا کوئی بھی شخص معلوم نہیں ہے
ان حالات میں صرف 'بچے' کی علامت ایسی ہے جو ہمیں
مستقبل کی شکل دکھا سکتی ہے۔ اور ان اقدار کو تاریخی
عمرانی، فکری اور ثقافتی حدود اربع میں پھیلا سکتی ہے
جنہیں میں نے بنیادی انسانی اقدار کہا ہے۔ آزادی
کا انسانی اقدار کی فہرست میں بنیادی ہونا ضرور ہے
لیکن نیکی اور روشنی کی قدروں کے بغیر یہ انسانی
قدر (آزادی) بے کار ثابت ہوتی ہے ان قدروں کو
شاعری میں مؤثر طور پر پیش کرنے کے لئے شاعری کی
تعریف کا بدلنا لازمی ہے۔ ایک لمبے عرصے سے ہم نے
شاعری کو تنقیدِ حیات کے طور پر قبول کیا ہے اور زندگی
کے معاملوں اور مسائل پر کڑی تنقید کی ہے یہ تنقید اس
طرح حاوی ہو چکی ہے کہ ہر ایک ادیب زندگی کے مسائل
پر رائے دینے اور فیصلہ صادر کرنے کا حق اپنا چکا ہے۔
شاعری کالجوں کی مجلس مذاکرہ میں بدل چکی ہے اور
شاعر علم عمرانیات کا پروفیسر بن چکا ہے ان حالات
میں جب ہم پوچھتے ہیں کیا مستقبل حقیقت ہے؟ تو وہ
جواب دیتا ہے کہ حالات کا مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے
جب تک حالات نہیں بدلتے۔ مستقبل کے بارے میں
سوچنا خود فریبی ہے۔ میں "حالات" کے اثر کو انسان کے
مستقبل میں شریک کرنے سے انکار نہیں کرتا لیکن اتنا
ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ حالات اور انسان دونوں کا بدلنا
انتہائی ضروری ہے۔ حالات ضرور بُرے سہی لیکن ہم جس
انسان کو جانتے ہیں وہ بھی کئی بیماریوں کا شکار ہے۔
وہ بُرا ہرگز نہیں ہے لیکن جو بیماریاں اس کے ساتھ پیوست
ہیں۔ ان کے باعث وہ نیکی اور روشنی کی اقدار کو نہ تو
پہچان سکتا ہے اور نہ پہچان کر اپنا سکتا ہے۔

ایسی صورت میں شاعری کونسا فرض ادا کر سکتی ہے؟

شاعری کا نیا کام تنقیدِ حیات کی بجائے کشفِ
حقیقت کا ہے۔ اور حقیقت سے مراد نیکی اور روشنی کی
اقدار ہیں۔ یہ حقیقت انسان کے وجود میں ظاہر ہوتی ہے
اور دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر دنیا کی شکل بدلنے
کی سعی کرتی ہے زمین پر آخرت کا تصور مستقبل کے
تصور میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ لہٰذا کشفِ حقیقت
کا فرض انجام دینے کی کوشش میں شاعری دراصل آنے
والے زمانے کے خدّ و خال واضح کرنے کا فرض انجام
دیتی ہے۔ 'بچے' کی علامت سے میری مراد اس پاکیزہ آرزو
اور کیفیت سے ہے جس کے ساتھ بچہ زندگی کے پردوں
کو دیکھتا چلا جاتا ہے اس لئے امرِ کشفِ حقیقت کا کام
بچے کی غیر ملوّث آنکھوں کی مدد سے کیا جائے تو شاعری
حُسنِ دنیا کی تصویر پیش کرے گی۔ وہ ہر اعتبار سے
اچھی اور بہتر ہوگی!

یہ سوال مجھے شاعری اور کشفِ حقیقی کی طرف لوٹاتا ہے!

شاعری کے ذریعے ہمیں بیرونی دنیا کو بدلنے کی
بجائے اور فیصلے صادر کرنے کی جگہ لفظوں کی مدد سے
ایک ایسا شعری عکس پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو بیدا
تو زمانۂ حال میں ہو لیکن جس کے ذریعے مستقبل کے

چہرے کی جھلک بھی نظر آئے ۔ مستقبل سے مراد شاعر کا وہ مستقبل ہے جسے وہ برپا کرنا چاہتا ہے اور اگر یہ مستقبل نیکی اور روشنی کی اقدار سے مرتب ہوتا ہے تو شاعری کشفِ حقیقت کا وہی کام انجام دے گی جس کی طرف میں اس وقت اشارہ کر رہا ہوں ۔ شاعری کا کام استعارے عکس نامے اور علامات کے ذریعے ان اقدار کا ہم پہ ظاہر کرنا اور کھولنا ہے جن سے ہم اس وقت شعری طور پر نا آشنا ہیں ۔

زیرِ نظر مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک شاعر کی نظم کا نثری اردو ترجمہ نقل کرتا ہوں جس میں میرے خیال کے مطابق نیکی اور روشنی کی اقدار شعری کشف کے ذریعے پیش کی گئی ہیں ۔

"سنو! شاعر کی آواز سنو!
جو ماضی حال اور آنیوالے زمانے سے واقف ہے ،
جس کے کان اس آواز سے آشنا ہیں
جو پرانے اور کبھی نہ مٹنے والے درختوں میں گونجتی ہے ،
فالج سے یخ بستہ دل کو ہلاتے ہوئے
اور شام کی برستی ہوتی اوس میں روتے ہوئے
یہی آواز ۔ جو ستاروں کو روک لیتی ہے ۔
اور بجھی ہوئی روشنی کو نیا اُجالا بخشتی ہے ۔
پکارتی ہے ۔ اے زمین! لوٹ! اور واپس آ ،
اوس سے بھیگی ہوئی گھاس سے باہر نکل ،
کہ رات جا چکی ہے ۔
اور صبح نیند اور خاک میں جاگنے لگی ہے !
لوٹ کر مت جا !
لوٹنے کی غرض کس لئے ہے ؟
آسمانوں کے ستارے
اور سمندروں کا پانی
صبح کے آنے تک صرف تیری میراث ہے !"

اس نظم میں شاعر زمین سے جو سو رہی ہے ، خطاب کرتا ہے اور رات اوس اور اندھیرے کے اشارات استعمال کرتے ہوئے 'صبح' کو نظم کے شعری مرکز میں رکھ دیتا ہے ۔ ایسا کرتے ہوئے شاعر تاریکی اور روشنی کے درمیان تقابل پیدا کرتے ہوئے اور نظم کی روانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قاری کے ذہن سے روشنی کے عکس کو اوجھل نہیں ہونے دیتا ۔ اس شعری ماحول میں جو دوسری بات دکھائی دیتی ہے وہ شاعر کی آواز ہے جو زمین کو لوٹنے اور واپس آنے کے لئے کہتی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوٹنا اور واپس آنا کس منزل سے کس منزل کی طرف ہے ؟ نظم کے جغرافیے میں لوٹنے کا رُخ موسم سرما سے موسم بہار کی طرف ہے موسم بہار میں زمین اپنے بچپن کی طرف لوٹتی ہے قرونِ وسطیٰ کا ایک شاعر کہتا ہے ۔

بہار کے دنوں میں زمین اس دن کو
یاد کرتی ہے جو اس کی ولادت کا دن ہے"

ان باتوں کی موجودگی میں صبح بیک وقت آغازِ سحر اور اولین کی معصومی اور ایک ایسے زمانے کی علامت بنتی ہے جہاں ایک دائمی صبح ہے اور تاریکی کا جہاں کبھی گذر نہیں ہوتا ۔ نظم کے یہ سب اشارے اتنی تاثیر اور گہرائی نہ پاتے اگر شاعر کا خلوص ان اشاروں اور اجزا کو اپنے جذبے کے ساتھ یکجان نہ کرتا جس شاعر کی آواز نظم کی دنیا

(باقی بر صفحہ ۳۳)

اقبال احمد نجم
بی۔اے۔ سال اول

الرفیق الاعلیٰ

خدائے عزّوجل یعنی احسن الخالقین نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اس دنیا میں تخلیق کیا۔ اور اس کی پیدائش میں ایک راز رکھا..... ایک مقصد..... جسے اپنانے کی کوشش کرنا ہر انسان کا اوّلین فرض ہے۔ یہ راز اور مقصد ایسا نہیں ہے کہ اس تک انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہو بلکہ یہ راز انسانی فطرت میں نمایاں ہے اور فطرتِ حقیقی اکثر انسانوں سے پوشیدہ ہے۔ خدائے علیم و قدیر نے انسانی فطرت کو فطرتِ الٰہیہ سے خاص مناسبت عطا کی ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ فطرت جو خدا تعالےٰ کی پیدا کردہ ہے کس طرح سے انسانی وجود میں کارفرما ہے۔ بعض انسان دنیا کے لالچ و طمع کی رعایت سے اور دل کے میلا ہو جانے کے باعث اپنے خالق کو بھلا دیتے ہیں ان کی اصل فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ اور ایک نام نہاد فطرت جنم لے لیتی ہے تب وہ ان نئے پیدا شدہ حالات کو ہی اصل فطرت جان کر اس کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چاندی سونے کے سکوں اور لعل و یاقوت کے ہاروں سے محبت کرنے لگتے ہیں حالانکہ نسلِ انسانی کا مدعٰی اور مقصد دنیا سے بہت بلند عرشِ معلّٰی پر ہوتا ہے۔ کاش وہ جانتے کہ یہ ادنیٰ چیزیں نجاست اور زہریلے سانپ ہیں جنہیں وہ اپنے گلے کی زینت بنا رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ نجاست ان کے پاکیزہ اخلاق کو ناپاک بنا دے اور وہ انہیں ڈس کر ان کی روح کو زہر آلود کر دے۔

فطرتِ صحیحہ کا یہ خاصہ ہے کہ وہ انسان کو خدا کی طرف لے جانے میں ممد و معاون ہے اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب مصیبتوں کے بھنور میں پھنسا ہوا راہِ مستقیم سے برگشتہ، دل تنگ اور دل برداشتہ انسان کسی نیّا میں بیٹھ کر دور موجوں سے کھیلتا..... مسکراتا اپنا غم غلط کرنے کے لئے کسی موہوم دوست کو ملنے جا رہا ہو۔ تو ناگاہ اس کا حقیقی غمخوار جس کی محبت اس کے دل کے لحافوں میں ٹھٹھری پڑی تھی دلآزاری اور تکلیف کے رنگ میں نہیں بلکہ رحمت اور ہمدردی کے پہلو سے اس بھولے بھٹکے کو اپنی راہ دکھانے کی خاطر..... اپنی محبت کا راز ظاہر کرنے کی خاطر..... اپنے عشق کا درس دینے کے لئے۔ شام کی پرکیف فضا کو کالی گھنگھور ڈراونی گھٹاؤں میں بدل دیتا ہے۔ ہوائیں بے چین اور مضطرب ہو جاتی ہیں۔ بجلی چمک کر اسے گھورتی ہے اور کڑک کر اس کے جسم پر لرزہ طاری کر دیتی ہے۔ اور موجیں خوفناک ہو کر اس کی ننھی سی نیّا پر یوں جھپٹتی ہیں جیسے ان کی آن میں اسے ہڑپ کر جائیں گی..... مگر در اصل ایسا نہیں ہوتا..... راز فاش ہو جاتا ہے فطرتِ صحیحہ تمام پردوں کو

چیرتی دندناتی ہوئی ظاہر ہوجاتی ہے یعنی اس چھوٹی سی کشتی کا مکین بڑے ہی سوز و گداز اور رقت بھری آواز میں اپنے خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زیادتِ درد سے اس کا دل ماہیٔ بے آب کی مانند پھڑک کر اس کے سینہ سے نکل بھاگے گا اس وقت اپنے دنیاوی دوست کو بھول جاتا ہے اور اپنے مالک کو پکارتا ہے۔

"اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ"

اے مالک! اے میرے پیارے آقا۔ میں نادم ہوں میں نے تجھے بھلا دیا تھا مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔ یہ سچ ہے میرے گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے میری آنکھوں میں خون نہیں بلکہ زہر گردش کرتا رہا۔ اے میرے مشکل کشا تو ہی میرا حقیقی دوست ہے اے غفار! میں تیرے ان ایلچیوں کو جو وقتاً فوقتاً تیری طرف سے نامہ ہائے محبت لاتے رہے بھول گیا تھا۔ اور تیرے سب سے زیادہ محبوب اور پیارے حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی نصیحتوں کو میں نے فراموش کر دیا تھا۔ اے میرے معبود میں تیری شان میں گستاخیاں بھی کر جایا کرتا تھا۔ مگر میں تیرا بندہ ہوں۔ تیرا عاجز بندہ۔ تو مجھے معاف کر۔ میری توبہ قبول کر لے اے ستار میری لغزشوں اور میری غفلتوں پر اپنی ستاری کی رعایت سے پردہ پوشی فرما۔ میں تجھے آئندہ کبھی نہیں بھولوں گا۔ اے کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ تو ہی میری زندگی کی متاعِ عزیز ہے جو لازوال ہے جسے کوئی فنا نہیں۔

تب اپنے بندہ کی یہ آہ و زاری سُن کر مالکِ کون و مکان کی محبت بھی جوش میں آتی ہے۔ اپنے بندے کے اعترافِ گناہ اور سچی توبہ پر ایک گم گشتہ راہ کے صراطِ مستقیم پر آجانے سے خدا اس قدر خوش ہوتا ہے۔ کہ اتنی خوشی ماں کو بھی اپنے بچے کی کامیابی پر نہیں ہوسکتی۔ بلکہ ماں کی خوشی تو اللہ کی خوشی کے سامنے کچھ حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ تب بادل چھٹ جاتے ہیں ظلمت و گمراہی اور آلام و مصائب کے بادل — پھر اس کے بعد وہ بندہ خدا کے حضور سرخروئی حاصل کر لیتا ہے اور خدا کی نصرت اور تائید اس کے شاملِ حال ہوجاتی ہے اس حکیم و رحیم خدا کی بھی کیا شان ہے کسی کو تو سمندر کی تند و شوخ موجوں پر ملتا ہے اور کسی کو اپنا دیدار سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں کرا دیتا ہے کوئی اسے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر جلوہ فگن پاتا ہے۔ تو کوئی اندھیرے غاروں میں اس ازلی یار کے نور سے حصہ وافر پاتا ہے۔ اے کاش! ہر انسان اس گوہرِ یکتا کی قدرت نمائیوں کا مزہ چکھ سکے۔

ایک واقفِ حال لکھتا ہے اور کیا خوب لکھتا ہے

؎ کیا بدبخت وہ انسان ہے جس کو اب تک یہ پتہ نہیں کہ اس کا ایک خدا ہے جو ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ ہمارا خدا ہمارا بہشت ہے ہماری اعلیٰ لذات ہمارے خدا میں ہیں کیونکہ ہم نے اسے دیکھا اور ہر ایک نے خوبصورتی اس میں پائی۔ یہ دولت لینے کے لائق ہے

اگرچہ جان دینے سے ملے۔ اور یہ لعل خریدنے کے لائق ہے اگرچہ تمام وجود کھونے سے حاصل ہو۔ اے محرومو! اس چشمہ کی طرف دوڑو کہ وہ تمہیں سیراب کرے گا۔ یہ زندگی کا چشمہ ہے جو تمہیں بچائے گا۔ میں کیا کروں اور کس طرح اس خوشخبری کو دلوں میں بٹھا دوں۔ کس دف سے بازاروں میں منادی کروں کہ تمہارا یہ خدا ہے۔ تا لوگ سن لیں۔ اور کس دوا میں علاج کروں تا سننے کے لئے لوگوں کے کان کھلیں"

خدا تعالیٰ جس نے چمن کے پھولوں کو رنگ و بُو دی۔ دریا کی چاندنی میں نکھری ہوئی لہروں کو ادائیں اور ہواؤں کو حسینانِ چمن کی زلف ہائے عنبرین کے لہرانے کی طاقت عطا کی۔ وہ کیسا عظیم خدا ہے کہیں تو بادلوں کو رحمت بنا کر برساتا ہے اور کہیں رات جیسی کالی گھٹاؤں کو عذاب بنا کر گنہگار انسانوں پر نازل کرتا ہے۔۔۔۔ یہاں تک کہ بجلی کی چمک اور کڑک سے دلوں کو جھنجوڑ ڈالتا ہے تا کہ وہ اسے پہچانیں اور اپنے حقیقی مقصد کو اپنائیں۔ اس دھرتی کا پیدا کنندہ بادلوں سے جھانکا۔ شمس و قمر سے اس نے اپنے نور کی تابناکی اور حسن کا مظاہرہ کیا۔ آخر جب کم ظرفوں نے کسی طور سے بھی نہ سمجھا تو ان پر حجت تمام کرنے کے لئے اپنی طرف سے ڈرانے اور ساتھ ہی ساتھ خوشخبریاں سنانے والے رسول بھیجے تا کہ اس کی مخلوق خالقِ حقیقی کے آستانہ پر گر جائے۔ اور اسی کی ہو کر رہے اس کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے وہ ہر آن محبت کی چادر اپنے بندے پر ڈالنے کے لئے تیار رہے۔ کہتا ہے اے میرے بندے تو کدھر جا رہا ہے۔ میں ہوں تیرا خالق۔ میں نے تجھے پیدا کیا۔ میں تجھ سے اُلفت و محبت کرنے کے لئے تیار بیٹھا ہوں۔ عشق کی راہوں پر قدم مارنے کی کوشش تو کر۔ بلا جستجو کچھ نہیں ملا کرتا اور اگر ٹھوکریں نہ ہوں تو عقل کامل نہیں ہوتی۔ اور اگر عقل کامل نہ ہو تو انسان عشق و محبت کی بھٹی میں کود کر اپنے نفس کی چربی کو پگھلا نہیں سکتا۔ پس کیونکر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ بغیر جستجو و کوشش اور آزمائش و امتحان کے انسان تمام حسینوں سے زیادہ حسین کا عشق اور محبت حاصل کر لے۔

خدائے قدوس اپنی قدوسیت کی چادر اپنے بندوں پر ڈالنے کے لئے ایک دفعہ پھر بے چین ہو گیا اور اس نے پھر میرے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی خو و بو اور اس کا عکس اور ظل بنا کر حضرت احمد علیہ السلام کو اس دنیا میں مبعوث کیا۔ تا پھر اس دنیا میں اس کی حمد کے گیت گانے والے پیدا ہوں۔ اور اس کی بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے اسی طرح زمین پر بھی ہو۔ اور نسلِ انسانی پھر اپنے حقیقی ولی اور دوست سے متعارف ہو جائے

حضرت احمدؑ فرماتے ہیں۔

" رحمت کے نشان دکھلانا قدیم سے خدا کی عادت ہے۔ مگر تم اس حالت میں اس عادت سے حصہ لے سکتے ہو کہ تم میں اور اس میں کچھ جدائی نہ رہے اور تمہاری مرضی اس کی مرضی تمہاری خواہشیں

اس کی خواہشیں ہو جائیں - اور تمہارا سر ہر وقت اور ہر حالت مراد یابی اور نامرادی میں اس کے آستانہ پر پڑا رہے تا جو چاہے سو رہے - اگر تم ایسا کرو گے تو تم میں وہ خدا ظاہر ہو گا جس نے مدت سے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے کیا کوئی تم میں ہے جو اس پر عمل کرے ؟ اور اس کی رضا کا طالب ہو جائے ؟ ...... اس کی توحید زمین میں پھیلانے کے لئے اپنی تمام طاقت سے کوشش کرو ... حلیم اور نیک نیت اور مخلوق کے ہمدرد بن جاؤ تا قبول کئے جاؤ ... ہلاکت کی راہوں سے ڈرو - خدا سے ڈرتے رہو اور تقویٰ اختیار کرو اور مخلوق کی پرستش نہ کرو اور اپنے مولیٰ کی طرف منقطع ہو جاؤ دنیا سے دل برداشتہ رہو اور اسی کے ہو جاؤ اسی کے لئے زندگی بسر کرو اور اس کے لئے ہر ایک ناپاکی اور گناہ سے نفرت کرو کیونکہ وہ پاک ہے - چاہیئے کہ ہر ایک صبح تمہارے لئے گواہی دے کہ تم نے رات تقویٰ سے بسر کی - اور ہر ایک شام تمہارے لئے گواہی دے کہ تم نے ڈرتے ڈرتے دن بسر کیا "

یہ نصائح ہیں آج کی دنیا میں اس شخص کے لئے جو حقیقت میں راحتوں اور آسائشوں سے اپنی جھولی بھر لینا چاہتا ہو - حقیقت میں آج دنیا میں لاعلمی کا دور دورہ ہے ..... حقیقی روحانی علوم کا فقدان ہے .... ہر طرف فسق و فجور اور گمراہی و ضلالت نے پیر پھیلائے ہوئے ہیں ..... آج کا انسان اپنی فطرت کی آواز سننے سے قاصر ہے ..... اور اپنے حقیقی مولیٰ کا تصور بھی اپنے دماغ میں لانا پسند نہیں کرتا .... دنیا شراب دوستی کے کھنکتے ہوئے جاموں میں مدہوش ہو کر رہ گئی ہے ..... مخلوقِ خدا کی خدمت کی بجائے آج زر و جواہر کی تجوریاں عصمت و ضمیر کی خرید و فروخت پر صرف ہو رہی ہیں - اس دنیا کو ہم اس حسین دلہن سے تشبیہہ دے سکتے ہیں جسے عالم شباب میں ہی تپ دق جیسی موذی مرض نے آگھیرا ہو - اور اسے اس افراتفری کے عالم میں اپنے سرپرست اپنے مالک اور آقا کا خیال نہ رہا ہو -

ہر صاحب چشم بینا کو چاہیئے کہ اس خطرناک دور میں سنبھل کر چلے اس پل صراط پر سیدھا کھرا اور گناہوں کے بار سے ہلکا ہو کر چلے تا نجات اس کی طرف خود بخود بھاگی چلی آئے - وہ اس کے گلے لپٹ کر اسی کی ہو جائے - پھر خدا کی رضا اس سے کبھی علیحدہ نہ ہو - یہاں میرا منشاء یہ نہیں ہے کہ انسان دنیا سے بکلی طور منہ پھیر کر کسی پہاڑ کی پرانی کھوہ میں ڈیرا لگا لے اور سادھوؤں اور راہبوں کی طرح بیگانوں کی سی زندگی بسر کرنی شروع کر دے مذہب اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اسلام میں فطری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی کا ایسا لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے جس کی مثل کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے حقوق اللہ میں سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس سے محبت کا اظہار بھی ہے لیکن خدا کی محبت کا یہ تقاضا بھی ٹھہرایا کہ اس کے عیال سے بھی محبت کیجائے

جیسا کہ انگریزی میں مثل ہے :-
"Love me and love my dog"
ایک بزرگ کا یہ قصہ خاصا مشہور ہے کہ جب فرشتہ اُن کے پاس آیا تو انہوں نے اپنا نام مخلوق خدا سے محبت کرنے والوں کی فہرست میں لکھوایا اور اگلے دن خدا کے محبوبوں کی فہرست میں اپنے نام کو سرِ فہرست پایا۔

★ ★ ★

حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی پوری طرح ادا کرنے چاہئیں۔ اور بندوں کے حقوق میں دوستوں کے حقوق بھی شامل ہیں۔ مگر دوست کی پہچان ذرا مشکل امر ہے نہ تو آجکل کے دنیاوی دوست ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں نہ ہی ان کو علم ہے کہ دوستی کیا چیز ہے۔

درحقیقت دوست وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے — جو بے غرض محبت کرے — جو دلی ہمدردی وعقیدت رکھے — جو اچھی اور نیک نصیحت کرتا رہے — جو گناہ کے راستہ سے بچاتا رہے — جو روحانی محبت کرے — جو خوشامد سے پرہیز کرے — جو انسانیت وشرافت کا سبق سکھلائے اور زندگی بھر وفا کرتا رہے — جو برائیاں بتلائے اور حق وصداقت کا رستہ دکھلائے — جو دوست کے آنسوؤں کو اپنے دامنِ محبت میں جذب کرلے — جو غم کی حالت میں صبر کی تلقین کرے اور تمہارے غصہ سے بھی محبت کرے — دوست وہ ہے جو تمہیں کامیاب زندگی گذارنا سکھادے جو فرض کی یاددہانی کرائے اور محبت وشفقت کی ترغیب دلائے — جو تمہیں خدا کا سچا دوست بنائے۔ جو قبائح وحرص سے نفرت کرے۔ سچ مچ اگر دنیا میں ایسا ایک بھی دوست مل جائے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں۔ تو اس سے بڑھکر اور کوئی خوش قسمتی نہیں ہوسکتی مگر آجکل یہ امر ناممکنات میں شمار ہوتا ہے۔

حقیقی دوست کی بھلا محبت وہم نشینی سے جو راحت وسرور حاصل ہوتا ہے۔ وہ نہ تو دنیاوی زندگی کی رعنائیوں اور دلفریبیوں میں ملتا ہے اور نہ ہی انسانی حیات کے دلکش تبسم آمیز لمحوں میں ... نہ بادِ نسیم کے لطیف پرسرور جھونکوں میں ..... نہ چڑیوں کی دل موہ لینے والی سریلی صداؤں میں نہ آفتاب کی زرتیں کرنوں میں اور نہ ہی نیلے آسمان کے مسکراتے ہوئے ستاروں میں۔ نہ دریا کی بل کھاتی ہوئی لہروں میں اور نہ سمندر کی موجوں اور بہتی ہوئی شوخ آبشاروں میں ..... نہ گلشن کے شگفتہ پھولوں میں .... اور نہ زمین کے سبزہ زاروں میں .... بلکہ اگر خوشی ملتی ہے تو حقیقی دوست کی محبت میں جو یقیناً خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

دنیا کے دوست تو اکثر کالجوں اور سکولوں میں معصوم اور نیک فطرت نوجوانوں کی فطرت مسخ کرنے کے لئے سینما دیکھنے اور دکھانے کی ترغیب دیتے ہیں لغویات کی طرف ان کی توجہ مرکوز کرکے زندگی کی دوڑ میں ترقی کی طرف لیجانے کی بجائے پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ عمل صالح کی نصیحت کرنیکی بجائے

بُرے اعمال کو خوبصورت کرکے دکھاتے ہیں۔ مایوسی و ناکامی پر شکستہ دل ہو کر موت کی آرزو کرنا سکھاتے ہیں۔ گناہوں پر دلیر کرتے اور بہادری و شجاعت اور عبادت و محبت کے جذبہ کو ختم کر دیتے ہیں۔ لومڑی کی طرح مکار اور سانپ کی طرح زہریلا بنا دیتے ہیں۔

اے اس گلشن حسین کے ساتھیو! کیا وہ دوست کہلانے کے مستحق بھی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں .... انسانیت کے دشمن ..... یہ فرشتوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ ہاں البتہ یہ شیطان کے چیلے ضرور ہیں۔ یہ خود شیطان ہیں۔ اور دوسروں کو بھی شیطان بنانا چاہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ان دوزخیوں کے قول کو جو اس قسم کے دوستوں کی وجہ سے داخل جہنم ہوں گے یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ۝ يٰوَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ۝ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۗ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا ۝ (الفرقان آیات ۲۸ تا ۳۰)

ترجمہ:- اور اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا (اور) کہے گا۔ اے کاش! میں رسول کے ساتھ چل پڑتا۔ وائے بدبختی! کاش میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔ یقیناً اس نے مجھے خدا کے ذکر سے غافل کر دیا۔ جبکہ وہ (رسول کے ذریعہ سے) میرے پاس آیا تھا اور شیطان تو انسان کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

یہ ورد بھرے الفاظ ہوں گے ان دوزخیوں کے جو خدا اور اس کے رسول کو حقیقی دوست بنانے کی بجائے شیطان اور اس کی ذریت کو دوست بنا کر ان پر بھروسہ کریں گے حالانکہ شیطان تو مصیبت میں پھنسا کر بھاگ جانے والا ہے۔ اور جب دوزخ میں ایسے لوگوں کو اپنی کردہ خطاؤں کی وجہ سے سزا ملے گی تو وہ بے تحاشا چلا اٹھیں گے کہ کاش وہ فلاں شیطان کو دوست نہ بناتے اس نے تو تباہی کے گڑھے میں لا ڈالا۔ وہاں چیخنا اور چلانا بے سود ہوگا۔ کیونکہ چیخ و پکار ہی کام آئے گی جو اس دار العمل یعنی دنیا میں کی گئی۔

مقام غور اور جائے فکر ہے کہ کیا ہم میں سے کسی نے ایسا دوست تو نہیں بنایا ہوا؟ جو اسے جنت کی پرکیف فضاؤں سے دور بہت دور دوزخ کی جان جلا دینے والی تپشوں اور بلاؤں کی طرف لے جا رہا ہے۔ شیطان تو ازل سے ابد تک کے لیئے انسان کا دشمن نمبر ایک ہے۔ خدا تعالے نے بھی اشتہاری ملزم کی طرح اس کا ذکر بارہا قرآن کریم میں کرتے ہوئے ہوشیار کیا ہے۔ فرماتا ہے:-

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ۗ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۚ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝

(سورۃ کہف آیت)

ترجمہ:- اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے

فرشتوں سے کہا تھا کہ تم آدم کے ساتھ (ملکر) سجدہ کرو اس پر انہوں نے (تو اس حکم کے مطابق اس کے ساتھ ہو کر) سجدہ کیا۔ مگر ابلیس نے (نہ کیا) وہ جنوں[1] میں سے تھا سو اس نے (اپنی فطرت کے مطابق) اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی (ا سے میرے بندو!) کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو (یعنی شیطان کو) اور اس کی نسل کو (اپنے) دوست بناتے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے۔ وہ (یعنی شیطان) ظالموں کے لئے بہت ہی برا بدلہ ثابت ہوا ہے۔

خدا تعالےٰ واضح فرماتا ہے کہ تم اسے چھوڑ کر شیطان کو اس کے بدل کی صورت میں دوست بنانے کو تلے ہوتے ہو۔ یاد رکھو اسے نفع دینے کی طاقت نہیں وہ ظالم ہے اپنے ظلم سے کمائے ہوئے مال سے کچھ دے تو دے۔ تم اس حرام کے مال اور اس کے لالچ کی وجہ سے اپنی جان مصیبت میں پھنسا لوگے۔ اور یہ مال بد افعال کا محرک ہوگا۔ حالانکہ خدا تعالےٰ سے دوستی کرنے سے وہ دولت ملتی ہے جس کا تصور بھی یہ لوگ نہیں کر سکتے۔ تبھی تو یہ سرکش خدا کے پیدا کردہ آدم کے ساتھ ہر زمانہ میں بدسلوکی اور شرارت سے پیش آتے ہیں اور اپنی بدمستیوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اے میرے بندو! تم اس ظالم سے دوستی لگاتے ہو جو تم پر شروع سے ہی ظلم کرتا آرہا ہے۔ اس کے ورثہ میں ظلم ہے دیکھنا تم بھی کہیں اس کے ظلم کے وارث نہ بن بیٹھنا۔

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ؀ (انفال آیت ۴۱)

ترجمہ:- پس جان لو کہ اللہ تعالےٰ تمہارا حامی ہے وہ بہترین دوست اور بہترین مددگار ہے۔ نیز فرماتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ؀ (توبہ آیت ۲۳)

زیادہ تشریح کے لئے دیکھیں (النساء ۱۴/۴) (المائدہ ۱۲/۵) (توبہ ۲/۹، ۸/۱۵) (کہف ۱۲/۱۸) وغیرہ وغیرہ۔

ترجمہ:- اے مومنو! اپنے باپ دادوں اور بھائیوں کو (اپنا حقیقی) دوست نہ بناؤ۔ اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر سے زیادہ محبت کرتے ہوں اور تم میں سے جو لوگ ان سے ایسی دوستی کریں گے وہ یقیناً ظالم ہونگے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ قریبی رشتہ داروں یعنی باپ دادوں اور بھائیوں کو بھی اس صورت میں حقیقی دوست بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ وہ کفر کو زیادہ پسند کرتے ہوں۔ اور خدا کے احکام کی بجا آوری میں روک بنتے ہوں۔ عام انسانوں سے تو نسلی تعلق بھی نہیں ہوتا۔ ان کے متعلق خود تصور کر لیں کہ حکم کتنا واضح ہے۔

غیر قوم کی تہذیب سے محبت کرتے ہوئے اُسے

---

[1] یہاں جنوں سے مراد بڑے بڑے شریر اور مالدار لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو زر و مال کی پرستش کرتے رہتے ہیں۔ اور لوگوں کو گمراہی کا درس دینا ان کا وطیرہ بن چکا ہوتا ہے۔

اپنا ابھی دوستی کرنے کے مترادف ہے۔ اور پھر اگر یہ
دوستی خدائی احکام کی بجا آوری میں مانع ہو تو پھر
اس دوستی پر ہزار بار لعنت کرنی چاہیئے۔ آجکل
ٹیڈی ازم کا زور ہے۔ حالانکہ یہ چیز امریکہ کے جہلاء
کا لباس ہے۔ افسوس آج مسلمان کہلانے والے
بھی اس لباس کو پہننے میں ذرا عار محسوس نہیں کرتے
اس سے نہ تو نماز کی ادائیگی ہو سکتی ہے اور نہ ہی
کوئی اچھائی اس میں ہے وہی مسلمان جن کے باپ
دادوں نے اپنی تہذیب کا پرچار مغرب میں کیا تھا
آج ان کی ہی تقلید کر رہے ہیں ـــ یہ اس قسم کی
عریانیت ہے کہ اس سے شیطان کو اپنا حملہ کرنے
کا موقعہ ملتا ہے ـــ یہ شیطانیت ہے جس کا مظاہرہ
سڑکوں اور بازاروں میں کھلے بندوں کیا جاتا ہے
مصلح اعظم علیہ السلام کے چند احکام پر نظر ڈالئے
آپ فرماتے ہیں۔

"جو شخص بد رفیق کو نہیں چھوڑتا جو اس پر
برا اثر ڈالتا ہے وہ میری جماعت (یعنی حقیقی
مسلمانوں کی جماعت) میں سے نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔
ہر ایک زانی۔ فاسق۔ شرابی۔ خونی۔ چور۔ قمار باز
خائن۔ مرتشی۔ غاصب۔ ظالم۔ دروغگو۔ جعلساز
اور ان کا ہمنشین۔ جو اپنے افعال شنیعہ سے توبہ نہیں
کرتا اور خراب مجلسوں کو نہیں چھوڑتا وہ میری
(یعنی حقیقی مسلمانوں کی) جماعت میں سے نہیں ہے
۔۔۔۔۔ خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو اپنے دلوں کو صاف
کرتے ہیں اور اپنے دلوں کو ہر ایک آلودگی سے
پاک کر لیتے ہیں اور اپنے خدا سے وفاداری کا عہد باندھتے
ہیں کیونکہ وہ خدا کے ہیں۔ اور خدا ان کا۔ وہ ہر ایک
بلا کے وقت بچائے جائیں گے۔ احمق ہے وہ دشمن
جو ان کا قصد کرے کیونکہ وہ خدا کی گود میں ہیں۔
اور خدا ان کی حمایت میں ہے۔"

پس خدا کی حمایت اور دوستی حاصل کرنے
کے لئے ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرتے ہوئے ـــ
حقوق اللہ اور حقوق العباد پوری پوری طرح ادا
کرنا ہر راستباز انسان کا مقصد ہونا چاہیئے حقیقت
میں خدا تعالیٰ کی محبت سے بڑھ کر اور کوئی چیز
نہیں۔ اگر وہ گوہر مقصود مل جائے تو اس کے
سوا اور کسی چیز کی خواہش کرنا بے توفی ہے۔ حضرت
امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز
خدا تعالیٰ کے عشق سے مخمور ہو کر فرماتے ہیں۔

أَحْيَيْتَ نَفْسِي بِابْتِسَامٍ وَنَظْرَةٍ
غَشَّتْ وُجُودِي كُلَّهُ نَعْمَاؤُكَ

تو نے ایک مسکراہٹ اور نظر محبت کے ساتھ مجھے زندہ
کر دیا۔ اور تیری نعمتوں نے میرے سراپا کو ڈھانپ لیا۔

مَنْ يُخْجِلُ الْوَرْدَ الطَّرِيَّ بِلَوْنِهِ
عَيْنَايَ دَامِعَتَيْنِ أَوْ خَدَّاكَ

اپنے سرخ رنگ سے تر و تازہ گل و گلاب کو کون شرما
رہا ہے۔ میری دونوں خونبار آنکھیں یا تیرے سرخ رخسار

مِنْكَ السُّكُونُ وَكُلُّ رَوْحٍ وَرَاحَةٍ
مَنْ ذَا الَّذِي لَا يَبْتَغِي لُقْيَاكَ۔

سکون اور ہر قسم کا آرام و راحت تجھی سے ملتا ہے

(تو پھر) وہ کون ہے جو تیرے دیدار کا طالب نہ ہو۔

عَطِشَتْ قُلُوْبُ الْعَاشِقِیْنَ لِرَاحِكَ
فَادْرِكُوْا دَسَكَ وَاحِقْ مِنْ سَقْیَاكَ

عاشقوں کے دل تیری شراب کے لئے تڑپ رہے ہیں
پس تو اُن کی مجلس میں اپنے پیالوں کا دَور چلا۔
اور شرابِ محبت کی تقسیم سے ان کو بھی حصہ دے۔

آپ ایک اور جگہ اپنے اردو اشعار میں اسی جذبۂ عشق سے مخمور ہو کر فرماتے ہیں۔

تری دنیا میں فرزانے بہت سے پائے جاتے ہیں
مجھے تو بخش دے اپنی محبت کا جنوں ساقی!
مجھے قیدِ محبت لاکھ آزادی سے اچھی ہے۔
کچھ ایسا کر کہ پابندِ سلاسل ہی رہوں ساقی
ترے در کی گدائی سے بڑا ہے کون سا درجہ
مجھے گر بادشاہت بھی ملے تو میں نہ لوں ساقی

فدا ہوتے ہیں پروانے اگر شمعِ منور پہ
تو تیرے رُوئے روشن پر نہیں کیوں جان دوں ساقی

اے مسلمانوں کے گھروں میں جنم لینے والو! میرا خیال ہے اب مقصدِ حیات واضح ہو گیا ہو گا اس وقت تک ایسے انسان بے شمار ہو چکے ہیں جنہوں نے خدا کو ہی اپنا مقصود جانا۔ (خدا تعالےٰ ان سب پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے) انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے ہاں بھی مقرب ٹھہرے اور دنیا میں بھی سُرخرو ہوئے۔ بے شک وہ سب بھی ایک عام انسان کی طرح زندگی گذارتے تھے۔ مگر اُن کے دل میں ہر وقت ان کا یار نہاں ہوتا تھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا۔ کھانا۔ پینا چلنا پھرنا۔ بات کرنا اور بگڑنا غرض ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدا کے احکام کی بجا آوری میں گذرتا تھا۔ ہر وقت ان کے دلِ حزیں کو یارِ جاناں کی یاد تسکین بخشتی تھی۔ ان کے تصورات خیالات غرضیکہ ان کی زندگی کے تمام لمحات اسی کے لئے وقف ہوتے تھے۔ وہ دُنیاوی تعلقات رکھتے تھے مگر اصلی اور حقیقی تعلق جو بندے اور معبود کا ہے کبھی نہ توڑتے تھے۔

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے محبوب محمد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت عطا فرمائے کہ جنہوں نے اپنی جان اَللّٰهُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی کا ورد کرتے کرتے جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ اور ہم سب کو اپنا پیار نصیب کرے تا ہم سب خدا تعالےٰ کے مقرب بندے بنیں اور خدا کی رضاؤں پر چلتے ہوئے ہمارے دل کی گہرائیوں سے ہر دم یہ نکلتا رہے۔

اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(بقیہ) ہے عمل میں زندگی ...

ہزار ہا رکاوٹیں ہماری راہ میں حائل ہونگی اور ہمیں صحیح راہ سے گمراہ کرنے کی کوشش کرینگی لیکن ہم کوشش و سعی اور دوامِ عمل سے ان پر غالب آسکتے ہیں۔ اے خدا! تو ہماری ناکامیوں کو ہمارے اذہان سے محو کر دے تاکہ وہ ہماری ترقی میں حائل نہ ہوں اور ہمیں تنزل کی راہ سے محفوظ فرما تاکہ

۴۲ وہ ہمارے مقاصد و عزائم کے نشیمن کو جلا کر خاکستر نہ کر دے۔ یہ سچ ہے عمل میں کامیابی ہوتی ہے زندگی بنتی جا لپٹ جا لہر سے دریا کی تند

DONATIONS

Contruction work on the site of the new campus is in progress. The workshop is nearing completion and the Science Block has been started. To meet the huge expenditures, the worthy Principal has appealed to the ex-students of the college to come forward with their donations. In response to this appeal the following old boys have offered to donate one thousand rupees each. It is very pleasing to note that the ex-students are showing keen interest in their Alma-mater. Once again we remind our friends to follow the example set by their brethern and donate generously to this fund on the call of their Principal

1. Dr. Abdul Shakoor Ghani M.B.B.S., Abbotabad. (Rs. 400 paid)
2. Ch. Abdur Rahman Advocate, Gujranwala
3. Ch. Kanwar Idrees C.S.P., Chitral. (Rs. 1000 paid)
4. Ch. Mohammad Nasarulla Khan, Lahore.
5. Ch. Mohammad Islam Bhatti P.C.S., Swabi. (Rs. 50 paid)
6. Ch. Faiz Ahmad Aslam P.C.S., Marden. (Rs. 20 paid)
7. Ch. Jalal-ud-Din, Rawalpindi. (Rs. 100 paid)
8. Mr. Munawar Ahmad M.Sc., Sierraleone.
9. Mirza Anas Ahmad M.A., T. I. College, Rabwah.
10. Mr. A. R. Ghani M.Sc., T. I. College Rabwah.
11. Syed Nasir Ahmad Shah. Civil Engineer, Lahore. (Rs. 100 paid)
12. Mr. Munawar Ahmad, Kohat.
13. Dr. Abdur Rauf Ghani L.S.M.F., I/c, Pindi Sheikh Musa Hospital

محمود مجیب اصغر

محبت و عقیدت کے چند پھول

ایک عاشقِ صادق کا ہدیۂ اخلاص

۲۶ جون ۱۸۹۸ء کو حضرت شاہزادہ عبدالمجید صاحب نے حضرت احمد علیہ السلام کے حضور اپنے احوال پر مشتمل ایک خط لکھا۔ قحطِ روحانیت کے اس زمانہ میں اللہ والوں کے باہمی تعلقات کا تذکرہ یقیناً زیادتِ ایمان کا باعث ہوگا۔ اسی امر کے پیشِ نظر خاکسار قارئین المنار کی خدمت میں حضرت شاہزادہ صاحب موصوف کے متذکرۃ الصدر مکتوب گرامی کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ ۔ (محمود)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً

اما بعد بخدمت اقدس حضرت امام الوقت گذارش آنکہ اس ناکارہ درافتادہ کو معلوم ہوا کہ آجکل شہزادہ والا گوہر صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جہلم نے اخبار سراج الاخبار میں میری نسبت لکھا ہے کہ فلاں نے اپنے اعتقاد سے توبہ کی ہے اور توبہ اس واسطے نصیب ہوئی کہ شاہزادہ صاحب نے میرے عقیدہ کی خرابی مجھ پر ثابت کر دی۔ سُبْحٰنَکَ اِنْ ھٰذَا اِلَّا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ بزرگوارا ..... میں نے نہ کبھی خیانت اور بزدلی دکھائی۔ اور نہ میں کبھی ان سے دبا جس سے ان کو میری توبہ کا یقین یا احتمال پیدا ہوا ہو۔ البتہ واعرض عن الجاھلین اور واذا خاطبھم الجاھلون پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ اس کو اگر انہوں نے توبہ سمجھ لیا تو یہ ان کی فہم رسا کی خوبی ہے لاحول ولاقوۃ اس قدر جھوٹ۔

بزرگوارا! اگرچہ ناچار شرفِ زیارت سے محروم ہے۔ مگر آنحضرت کی محبت اور عظمت اور ادب اور اطاعت اور کثرتِ یاد میری روح اور جان کا جزو ہوگیا ہے۔ میں اپنی جان سے کس طرح علیحدہ ہو سکتا ہوں۔ میرے پیارے میرے دل کا حال اس سے دریافت فرما جو سب بھیدوں سے واقف ہے ولا ینبئک مثل خبیر۔ میرے مولیٰ تو نے تو خدا اور رسول کا پتہ دیا۔ تو نے محبت کا راستہ بتلایا۔ تو نے قرآن سکھلایا۔ ہم غفلت میں پڑے سوتے تھے۔

تو نے ہی آن سمجھایا۔ ہم اُمی اور رسمی مسلمان تھے۔ تو نے ہی ہم کو حقیقی اسلام سے آگاہی بخشی۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ دعا کیا چیز ہے۔ اور تقویٰ کس شئے کا نام ہے تو نے ہی تو ان کا نشان ہم پر ظاہر فرمایا۔۔۔۔۔۔ غرض کہاں تک تیرے احسانات کو لکھوں وہ تو بے شمار ہیں تو ہمارا آقا۔ تو ہمارا مولیٰ ہم تیرے خادم ہم تیرے غلام۔ بھلا تجھ کو چھوڑ کر خدا کی لعنت کماویں میرے ہادی! اگر میں ایسا ضعیف الاعتقاد ہوتا تو مخالفوں کی نظروں میں خار کی طرح کیوں چبھتا۔ مخالف سے جب کبھی کسی گذر پر دو چار ہونے کا موقعہ پیش آتا ہے تو تجھ کو دیکھتے ہی غیظ و غضب سے بھر جاتا ہے۔ میں نے مسجدوں میں نماز پڑھنی ترک کر دی بدیں لحاظ کہ میاں عبداللہ صاحب سنوری سے مجھ کو روایت پہنچی ہے کہ جو لوگ خاموش بیٹھے ہیں گو مخالفت نہیں کرتے ان کے پیچھے بھی نماز درست نہیں۔ برادرِ گوارا۔ قاضی صاحب قاضی خواجہ علی صاحب اور صاحبزادہ افتخار احمد صاحب اور منشی ابراہیم صاحب اور میاں الہ دین صاحب وغیرہ وغیرہ احباب لودیانوی سے اپنے غلام کا حال استفسار فرماویں میرے آقا مجھ کو کسی نازک موقعہ اور سخت ابتلاء کے وقت بھی لغزش نہیں ہوئی۔ چہ جائیکہ اب ان ایام میں جبکہ آپ کے متواتر کثیر التعداد عظیم القدر اور جلیل الشان نشانات علمی و عملی معرض ظہور میں آچکے اور روزِ روشن کی طرح حق کی صداقت چمک اٹھی۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ استقامت محض حضور ہی کی نیم شبی دعاؤں کا ثمرہ ہے ورنہ ہم تو وہی ہیں جو ہیں۔ مرید دل میں صدق اور راستی چاہیئے۔ پھر انشاء اللہ آپ کی فاذا فرغت فانصب والی تعمیل کے طفیل سے ضائع نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ لیکن خدا کے فضل سے دل غنی ہے۔ دنیادار دولتمند میری نظر میں مرے ہوئے کیڑے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ یہ میں ہی کیا بلا۔ یہ تو مُردے ہیں جن میں جان نہیں ان کی مکروہ صورتیں نفرت کے لائق ہیں۔ ان سے دبنے والا اور ان کا دستِ نگر انہی جیسا کوئی اندھا ہوگا۔

اے میرے ہادی میں ارسال عرائض میں اس واسطے دریغ کرتا ہوں کہ میں اپنے اس فعل کو اخفٰ سمجھتا ہوں۔ اور کہتا ہوں کہ میں کیا اور میرے عرائض کیا۔ یونہی بے فائدہ سیدگانِ عالی کو کیوں تکلیف دوں عریضہ کے کھولنے میں پڑھنے پڑھانے میں چند منٹ اوقاتِ اشرف میں سے ضائع ہونگے ناحق کی حرج ہوگی۔ صحبتِ اقدس اور شرفِ زیارت مبارک سے باوجود چند در چند موانع غیر مستفیض رہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ مہربانا! حضور کی تصنیفات پُر انوار اور تالیفات حکمت بار جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں میرے ازدیادِ ایمان و عرفان کے لئے رہبر کامل کا کام دیتی ہیں۔ جو جو حالات آنجناب پر حضرت کبریا کی طرف سے منکشف ہوتے ہیں اور پھر ان روحانیات کو اور ان کشوف و خوارق در رؤیا و الہامات کو آپ درج صحفِ مطہرہ فرماتے ہیں کم و

بیش ان روحانی کوائف اور تاثرات کی حلاوت سے میرے
مذاق جان کو بھی چاشنی نصیب ہوا کرتی ہے۔ اور ایسا احساس
ہوتا ہے کہ گویا میں خود ان حالات کا مورد ہوں لیکن میں
اس دوری و مہجوری کو ہرگز ہرگز اپنے واسطے پسند نہیں
کرتا۔ کیونکہ مقربین بساط قدسی آیات کو جو جو برکات اور
خوبیاں حاصل ہیں، ان کا عشر عشیر بھی دور دستوں کو
نصیب نہیں۔ اصحاب صفہ کی جوتی اور دوسروں کا سر۔
اگر خدا کسی مخلص صادق کو بغیر اجر کے نہیں رکھتا۔ مگر
اصحاب الصفہ ما اصحاب الصفہ۔ کیا ہی صاحب نصیب
ہیں وہ لوگ جن کی نظر ہر صبح و مسا اس منظر اطہر پہ پڑتی
ہے۔ دولت صحبت کے برکات سے مالا مال ہوتے
ہیں۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے انوار کا، اطوار
کا، اخلاق کا، عادات کا، ریاضات کا، مجاہدات کا،
محاربات کا کامل نمونہ آپ کی ذات میں مشاہدہ کرتے
ہیں۔ خدائے قادر ذوالجلال کی جناب سے ہمیشہ یہی
دعا ہے کہ اے قدیر بے نظیر اپنے برگزیدہ مسیح
علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شرف ملازمت سے فخر و
عزت دے۔ قسم بخدائے لایزال کہ تیرے در کی
گدائی تخت شاہی سے بہت بہتر ہے۔ شہزادہ حبیب صاحب
نے مجھ پر سخت افتراء باندھا ہے اور حضور کو مجھ سے
بدگمان کیا۔ اگرچہ بندگان عالی کو مجھ جیسے ارذل
کی پرواہ ہی کیا ہے۔ خدا نے آپ کو وہ رفعت و منزلت
بخشی ہے کہ آپ کی ذات مجمع البرکات کو مرجع قدسیاں
بنا دیا۔ مگر اخفض جناحک للمؤمنین
پر غور کر کے اور بالمؤمنین رءوف الرحیم پر
نظر پڑا کر اس گستاخی پر جرأت ہوئی کہ تھوڑی دیر
کے واسطے تضیع اوقات بندگان عالی کر کے عفو
تقصیرات کا ملتجی ہو جاؤں۔ اور دست بستہ عرض پرداز
ہوں کہ

ہر چند نیم لائق بخشائش تو
بر من منگر بر کرم خویش نگر

...... (خاکسار عبدالمجید از لودیانہ محلہ اقبال گنج
۹ جون ۱۸۹۵ء)

قوم کے معمار

"سکولوں اور کالجوں کے لڑکے سٹرائیک کرتے ہیں اور اپنے جلسوں اور تقریروں میں یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ ہم قوم کے معمار ہیں۔ قومیں ہمیشہ نوجوانوں سے بنا کرتی ہیں۔ اور اس میں شبہ ہی کیا ہے کہ لڑکے قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سٹرائیک کرنے والے لڑکے ہی قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر تم اپنی بری عادات چھوڑ دیتے ہو تو تم فی الواقعہ قوم کے معمار ہو۔ لیکن اگر تم ایسی حرکات کرتے ہو۔ جن سے قوم کو نقصان پہنچتا ہے۔ تو تم قوم کے معمار کہلانے کے مستحق نہیں۔"

(تقریر حضرت امام جماعت احمدیہ ۶ دسمبر ۱۹۵۴ء بموقعہ افتتاح تعلیم الاسلام کالج ربوہ۔ مرسلہ محمد احمد)

کرشن احمد اے ایس
گیارہویں جماعت

تعمیرِ قوم میں اخلاق کا مقام

پیشتر اس کے کہ اصل مضمون شروع کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظِ اخلاق کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔

اخلاق کا واحد خُلق ہے۔ جب ایک انسان اپنی ہر قوت کو موقع اور محل کے مطابق سوچ سمجھ کر استعمال کرتا ہے تو ایسے شخص کو با اخلاق شخص کہا جاتا ہے۔ اگر انسان اپنے قویٰ اور جذبات کا استعمال موقع محل اور عقل کے ماتحت نہ کرے تو اچھے اخلاق سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات انسانیت کے دائرہ سے نکل کر حیوانیت اور درندگی کے دائرہ میں چلا جاتا ہے۔ پھر خوش قسمتی اگر اس کا ساتھ دے اور نیک صحبت اور نیک تعلیم اُسے میسّر آجائے تو اپنی اصلاح کر سکتا ہے اور درندہ سے انسان۔ انسان سے باکمال انسان اور پھر باکمال انسان سے باخدا انسان بن کر اپنے لئے اپنی قوم کے لئے اور اپنے ملک کے لئے مفید وجود بن سکتا ہے۔

اخلاق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ اخلاق جن کے ذریعے انسان کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنی آنکھ یا اپنے کسی اور عضو سے دوسرے کسی شخص کے مال یا جان یا عزت کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

اخلاق کی دوسری قسم وہ ہے جس کے ذریعے انسان کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنے مال یا اپنے علم یا کسی اور ذریعے سے دوسرے شخص کی جان یا مال کو کوئی فائدہ پہنچائے۔

اخلاق کی ان دونوں اقسام سے ظاہر ہے کہ قوم کے افراد میں جب یہ اخلاق پیدا ہو جائیں۔ تو ہر شخص کی جان۔ مال اور عزت انسانی دست برد سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سب کے لئے ایک پُرامن اور بہشتی زندگی جنم لے لیتی ہے۔ عدل۔ رحم۔ صدق حوصلہ، حیا جیسے اخلاق اپنے صحیح رنگ و شکل میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ با اخلاق بچے بچیاں۔ با اخلاق مرد و زن ایک نہایت خوشگوار معاشرہ پیدا کر دیتے ہیں اور جب ایسا پاکیزہ ماحول پیدا ہو جائے۔ تو قوم جلد جلد اپنی ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اور جب کوئی قوم حصولِ اخلاق کی طرف سے لاپروائی برتے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب نعمتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ پس تعمیرِ قوم میں اخلاق کا

کردار بڑا اہم ہے۔

ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم ہزاروں انقلاب رونما ہوئے کبھی قومیں بامِ عروج پر پہنچیں۔ کبھی قعرِ مذلت میں جا گریں۔ کبھی عزت و اقبال کی مالک و مختار بنیں۔ کبھی ذلت و رسوائی اور زوال و انحطاط کا شکار ہوئیں۔ جب ہم تاریخ اقوام پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ قومیں ہمیشہ پاکیزہ اور شستہ اخلاق سے ترقی کرتی ہیں اور بداخلاقیوں سے بگڑتی اور گرتی ہیں۔ مثال کے طور پر تاریخِ اسلام کی ورق گردانی کیجیے۔ ہم جا بجا دیکھتے ہیں کہ کفار مسلمانوں سے دنیوی طاقت کے لحاظ سے زیادہ تھے۔ وہ اپنی تعداد پر فخر کرتے تھے۔ اپنی تجارت پر فخر کرتے تھے۔ اپنے جمع کردہ اموال پر فخر کرتے تھے اپنے نوجوانوں کی جنگی مہارت پر فخر کرتے تھے اپنی اعلیٰ سواریوں پر فخر کرتے تھے اپنے مسحور کر دینے والے شاعروں پر فخر کرتے تھے۔ اپنے گرما دینے والے خطیبوں پر فخر کرتے تھے اپنے عقل و دانش میں مشہور بوڑھوں پر فخر کرتے تھے۔ قومی جذبات سے معمور سینوں والی ماؤں پر فخر کرتے تھے۔ قوم کی عزت پر مر مٹنے والے سپاہیوں پر فخر کرتے تھے اور اسی طرح اور بہت سے امور میں مسلمانوں کو اپنے سے ادنیٰ اور کمزور قرار دے کر ان کی تحقیر کرتے تھے۔ یہ کفار اس بات سے ناآشنا تھے کہ قومیں صرف مال و دولت وغیرہ سے ترقی حاصل نہیں کیا کرتیں بلکہ اخلاق و انکسار سے پھلا پھولا کرتی ہیں۔ با اخلاق قوم کے پاس سامان کم ہوں تو اپنی ترقی کے لئے کوشش کرتی ہے۔ دست و پا ہلاتی ہے اور کامیاب و کامران ہو جاتی ہے اور اکثر دوسرے سے گوئے سبقت اڑا لے جاتی ہے۔ اگر اخلاق سے کوئی قوم عاری ہو تو سامانوں کی فراوانی اس کو غافل و سست اور متکبر بنا دیتی ہے۔ عیاشی میں مبتلا کر کے سب کچھ برباد کرا دیتی ہے۔ گرتے ہوئے سوار ایک بچہ سے بھی کمزور ہوتے ہیں اور بوسیدہ عمارت ایک جھونپڑی سے بھی کم تر ہوتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ دشمنانِ اسلام جو طرح طرح کی بداخلاقیوں میں گرفتار تھے۔ جب فرزندانِ اسلام سے نبرد آزما ہوئے تو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے ان کے مقابل پر قرونِ اولیٰ کے مسلمان اپنی نیک کرداری اور اپنے اخلاقِ فاضلہ کی وجہ سے روئے زمین پر چھا گئے۔ اخلاقِ فاضلہ سے ان کے اندر جلا اور روشنی پیدا ہوئی۔ ان میں ایک نئی زندگی کی روح حرکت کرنے لگی۔ ان کے اندر ایسا تغیر پیدا ہوا کہ حکومت ان کے قبضہ میں آگئی۔ تمام ظالموں اور سرکشوں نے اپنی گردنیں ان کے سامنے خم کر دیں۔

موسوی قوم کیا تھی؟ پتھیروں کا کام کرتی تھی مگر جب ان میں عاداتِ ستودہ پیدا ہو گئیں اور نیکیوں میں بڑھ گئے۔ جب اپنی نیک کرداریوں سے انہوں نے اپنے مولیٰ کو راضی کر لیا۔ تو پھر وہی بادشاہ بن گئے۔ جب خدا ملتا ہے تو دنیا بھی مل جاتی ہے اور خدا کو پانے کا طریقہ یہی ہے کہ انسان اخلاق میں

ترقی کرے۔

اسی طرح حضرت عیسٰے علیہ السلام کو ماننے والے کیا تھے؟ چند ماہی گیر تھے جو مچھلیاں پکڑ کر اپنی گزر بسر کیا کرتے تھے۔ جب وہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور سب بد اخلاقیاں اور برائیاں ان سے دُور ہو گئیں تو دہی دنیا کے بادشاہ بن گئے۔

سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے کیا تھے؟ اونٹوں کے چرواہے تھے مگر اعمالِ صالح اور خدا داری کے باعث دنیا کے فرمانروا بن گئے۔ ان میں نیکی اور تقوٰی پایا جاتا تھا وہ غریبوں اور ناداروں کو کھانا کھلایا کرتے تھے وہ مساکین پر رحم و شفقت سے کام لیتے تھے وُہ مال و دولت کی حفاظت کرتے تھے۔ وہ قومی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر مقدم رکھتے تھے۔ وہ غلاموں اور نوکروں سے حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ وُہ عورتوں کے حقوق پوری دیانتداری سے ادا کرتے تھے کبھی ظلم و ستم کے قریب نہیں جاتے تھے یہ سب کچھ عمدہ اخلاق اور نیک عادات کا نتیجہ تھا۔

پس تعمیرِ قوم میں اخلاق کو ایسی ہی اہمیّت اور مقام حاصل ہے جیسے روزِ روشن میں آفتاب عالمتاب کو۔ زندگی کے لئے پانی اور ہوا کو کھیتوں اور باغوں کی سرسبزی و شادابی کے لئے انہار کو۔ جس طرح دن کو روشن رکھنے کے لئے سورج کی اشد ضرورت ہے یا جس طرح زندگی کو قائم رکھنے کے لئے پانی اور ہوا دونوں ضروری ہیں یا جس طرح باغوں اور کھیتوں کی سرسبزی و شادابی کے لئے دائمی نہروں کی سخت احتیاج ہوتی ہے بالکل اسی طرح تعمیرِ قوم کے لئے اخلاق کی اشد ضرورت ہے۔

حرفِ آخر کے طور پر عرض ہے کہ قوم میں عمدہ اخلاق کو پیدا کرنے کی ذمہ داری معمارانِ قوم پر ہے۔ اور تمام اخلاق کا سرچشمہ خدا تعالےٰ کا کلام یعنی قرآن مجید ہے اس امر کو ہمیشہ سامنے رکھنے کے لئے ہمیں یہ دعا سکھلائی گئی ہے۔ کہ اَللّٰھُمَّ زَیِّنْ اَخْلَاقَنَا بِالْقُرْاٰنِ کہ اے اللہ ہماری عادات و اخلاق کو قرآنِ مجید کے ذریعہ زینت بخش!

سیّد الانبیاء حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا۔ کہ اللہ تعالےٰ دنیا کی اقوام کو جب وہ سربلند ہونا چاہیں تو اپنی اس کتاب یعنی قرآن مجید سے ہی سربلندی بخشے گا۔

کاش ہماری قوم کے لوگ قرآن مجید سے اتنا پیار کریں۔ اخلاق و ایمان میں اتنی ترقی کریں اور خدا تعالےٰ کے ساتھ اپنا تعلق اس حد تک بڑھائیں کہ ان کے لئے بھی خدائی غیرت ہر آن جوش مارتی رہے اور یہ نہ صرف دشمنوں کی شرارتوں سے محفوظ رہیں۔ بلکہ نصرتِ الٰہی کے پھریرے اُڑاتے ہوئے ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتے جائیں اور دنیا کے لئے سچی خوشحالی کا موجب بنیں آمین۔

نوٹ:۔ مضمون ہذا کی تیاری میں "اسلامی اصُول کی فلاسفی" اور "درِ منثور" سے استفادہ کیا گیا ہے

ہدایت اللہ ہادی
گیارھویں جماعت

ہے عمل میں زندگی ...

زندگی روزمرہ کی مسلسل جدوجہد، کوشش وسعی اور عمل کا نام ہے۔ ہمارا ہر دوست و رفیق فانی ہے۔ پس ہمیں اس بات پر یقین کامل رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں کوئی بھی دائمی جیسے نہیں اور ہمیں چاہیئے کہ ہم تمام بری نفسانی خواہشات کو کچل دیں۔ تاکہ ہمارے نفس امارہ کی کامل اصلاح ہو۔

دنیا ایک عظیم الشان تلاطم خیز سمندر ہے۔ اگرچہ اس میں لعل و گہر نگینے اور دفینے موجود ہیں تاہم ان کا متلاشی اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالکر اور فضل الٰہی کا جاذب ہو کر۔ مجذوب کی حیثیت سے ان ذخائر مدفون کو حاصل کر سکتا ہے۔ ہمیں عبادت الٰہی اور کھیل کود کے مقرر کردہ اوقات کے علاوہ تمام وقت کسی تعمیری کوشش میں صرف کرنا چاہیئے۔ اور یہی ہمارا نصب العین ہونا چاہیئے۔

ہمیں اطمینان قلب حاصل کرنے کے لئے خدا تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے سچی محبت پیدا کرنی چاہیئے تاکہ ہم دین میں سرخرو ہوں اور دنیا میں بھی عزت پائیں۔ ہمیں اپنی امیدوں کو بلند رکھنا چاہیئے۔ اور یقین محکم اور عمل پیہم سے کام لیتے ہوئے زندگی کی راہوں پر چلنا چاہیئے۔ اور ہمیں تمام بُرے راستوں کو بدل دینا چاہیئے۔ اور اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہانتک کہ ہم علم و عمل کا ایک مثالی نمونہ بن جائیں۔ اور دنیا ہمارے علوم کے چشمہ سے فیضیاب ہو۔ اور ہمارا نفس اپنی زبان حال سے یہ کہہ دے کہ میں آج سے اپنے آپ کو ہر کوشش وسعی اور دوام عمل کی خاطر وقف کرتا ہوں —— زندگی اپنے لئے نئے راستے بنا رہی ہے جن پر ہمیں چلنا ہے اور امید و بیم کے جہازوں کو ان سمندروں میں سے نکالنا ہے جن کو ہیبت ناک طوفانوں اور خطرناک گردابوں نے گھیر رکھا ہے۔ تاکہ ہمارا جہاز صحیح و سلامت ساحل مراد پر پہنچ جائے اور ہم دین و دنیا میں فلاح پا دیں۔

قادر و توانا خدا ہرگز ذات پات، شکل و صورت نہیں دیکھتا۔ بلکہ وہ صحیح کوشش اور نیکی و تقویٰ کا متلاشی ہے سو اس آسمانی فیض کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جو کہ ایک شیریں چشمہ رواں ہے جس سے بنی نوع انسان کا ہر بشر استفادہ کر سکتا ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکتا ہے۔ (باقی صفحہ ۴۶)

احمد جواد مخدوم
بی۔اے فائنل

رسول کریمؐ کی پاکیزہ زندگی

غیر مسلم علماء کی آراء

کہتے ہیں عالم شباب میں انسان اپنے جذبات اور احساسات پر ضبط کھو بیٹھتا ہے۔ بچپن گذر چکا ہوتا ہے اور عہد شباب شروع ہوتا ہے۔ تمام قوٰی پورے عروج پر ہوتے ہیں — انسان کے اندر ایک خاص قسم کا جوش ہوتا ہے اس زمانہ میں نئی امنگیں اور نئے ولولے پیدا ہوتے ہیں خواہشات پر قابو رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر نیک صحبت ملی تو فلاح کی توقع ہو سکتی ہے اگر والدین کی کڑی نگرانی ہو تو بچے بری باتوں سے بچ سکتے ہیں۔ اگر یہ صورت حالات مفقود ہو۔ تو نیکی کا امکان بڑی حد تک محدود ہوتا ہے۔ اکثر نوجوان جنسی بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خدا سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اور ملک و قوم کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔

ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی جوانی آئی۔ مگر آپؐ نے کمال صدق و صفا و تقوٰی کی راہوں پر ایسا قدم مارا کہ خدا نے جوانی کے خاتمہ پر آپ کے بے نظیر اسوہ سے خوش ہو کر آپؐ کو اپنا محبوب بنا لیا اور نعمتِ نبوت سے سرفراز فرمایا۔ آپؐ کی سیرت کو سارے عالم کے لئے بہترین نمونہ قرار دیا نہ صرف یہ کہ آپؐ نے روحانیت میں ترقی کی بلکہ مادی دنیا میں بھی آپؐ کا کوئی مدمقابل پیدا نہ ہو سکا۔ عظیم الشان بادشاہ۔ خوشحال رعایا کے فرمانروا — اعلیٰ صحت کے حامل — اور بچپن سے ہی امین و صادق کے مصداق تھے۔

جب ہم اس وقت کے عربوں کی معاشرتی سیاسی اور اخلاقی حالت کا اندازہ لگاتے ہیں تو حضرت نبی کریمؐ کا مقام اور بھی بلند ہو جاتا ہے اور محبت اور بھی بڑھتی ہے — غریب اور یتیموں میں زندگی بسر کرنے والے بدو — چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہر وقت باہم برسرِ پیکار۔ زنا اور بدکاری، جھوٹ اور قتل و غارت سے دلبستگی بلکہ گناہوں پر فخریہ اشعار کہنا اس زمانہ کی خصوصیات میں سمجھے جاتے تھے۔

اس حالت میں آپؐ کا کوئی رفیق تھا نہ مددگار۔ یتیم ہونے کی حالت میں پیدا ہوئے۔ والدین و جدِ امجد کا سایہ چھوٹی عمر میں ہی مفقود ہو گیا۔ چچا کے زیرِ سایہ پرورش پائی — یہ ہیں وہ حالات جن میں آپؐ پڑھے۔ روحانی ترقی کی — دوسروں کی ترقی کا موجب بنے۔ وحشیوں کو پہلے انسان بنایا۔ پھر انسان سے باخدا انسان بنایا۔ خود خاتم النبیینؐ

یعنی تمام نبیوں کے سردار ہوئے — کیا یہ تمام واقعات آپ کی پاکیزہ زندگی کے زندہ گواہ نہیں ہیں؟ یقیناً ہیں حق، حق ہوتا ہے اور مخالفین بھی اسے ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں آپؐ کی پاکیزہ زندگی کے متعلق بعض غیر مسلم علماء کی آراء پیش کی جاتی ہیں۔

ابوطالب رسول کریمؐ کے حقیقی چچا تھے آپؐ نے مرتے دم تک اسلام قبول نہ کیا۔ مگر اس کے باوجود رسول کریمؐ کے اخلاق فاضلہ کے ہمیشہ مداح رہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

"میں نے ان کو نہ کبھی جھوٹ بولتے دیکھا نہ ناجائز ہنسی مذاق کرتے پایا۔ نہ جاہلیت کے کام کرتے ہوئے دیکھا اور نہ ہی بازاری لڑکوں سے میل جول رکھتے ہوئے دیکھا۔"

ابوسفیان جب ہرقل روم نے ابوسفیان سے حضرت نبی کریمؐ کے سابقہ حالات اور اُنؐ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا۔ تو اس وقت ابوسفیان نے کہا: "نہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی گئی اور نہ کبھی اس نے عہد توڑا۔"

ابوجہل رسول کریمؐ کا شدید جانی و مذہبی دشمن تھا۔ مگر اس کے باوجود آپؐ کے اوصاف حمیدہ کا مداح تھا۔ چنانچہ اکثر کہا کرتا تھا: اے محمدؐ! ہم تجھے جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس کو جھوٹا کہتے ہیں جو تو لایا ہے۔"

امیہ بن خلف سعد بن معاذ کی زبانی جب اس نے اپنے قتل ہونے کی پیش خبری سنی اور سعد کے بتانے پر کہ یہ رسول کریمؐ کی پیشگوئی ہے اور پوری ہوگی۔ تو وہ بیوی کو جا کر کہتا ہے: "رب کعبہ کی قسم۔ جب محمدؐ کوئی بات کرتا ہے تو جھوٹ نہیں بولتا ہے۔ مجھے فکر ہے کہ میں اس پیشگوئی کے مطابق قتل کیا جاؤں گا۔"

قریش عرب جب رسول کریمؐ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر اپنے بارے میں پوچھا تو سب قریش عرب نے متفقہ طور پر کہا کہ:۔

"ہم نے تجھے ہمیشہ سچا پایا۔"

عام محاورہ رسول کریمؐ کو اپنے رب سے اس قدر محبت تھی۔ کہ ان عربوں میں یہ محاورہ رواج پا گیا۔ کہ "محمدؐ اپنے رب پر عاشق ہو گیا ہے۔"

اوپر کے درج کردہ اقوال رسول کریمؐ کے زمانے کے شدید ہموطن دشمنوں کے ہیں۔ اب عیسائیوں اور ہندوؤں کے اقوال درج کئے جاتے ہیں:۔

ولیم میور مشہور مستشرق اور اسلام پر بہتان باندھنے اور اس کے خلاف زبان درازی کرنے میں ید طولیٰ کا حامل رسول کریمؐ کے متعلق اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" میں لکھتا ہے:۔

"محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نہایت انصاف پسند، حمدل اور با اخلاق ریفارمر تھے۔ ان کا صبر تحمل اور استقلال اخلاق انسانی کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔"

لین پول "حضرت محمدؐ نہایت با اخلاق اور تحمل بزرگ تھے۔ ان کی خدا ترسی اور عظیم فیاضی مستحق تعریف ہے۔ آپؐ اس قدر انکسار پسند تھے کہ بیمار کی عیادت کو جایا کرتے تھے۔ غلاموں کی دعوت کو قبول کر لیتے تھے۔ غریبوں سے زیادہ محبت رکھتے تھے۔ بکریوں کا دودھ خود دوہتے اور دیگر کام اپنے ہاتھ سے کرتے ۔۔۔ آپ بلاشبہ ایک مقدس پیغمبر تھے۔" (سپیچز آف محمدؐ)

کارلائل "حضرت محمدؐ کا دل نہایت صاف شفاف اور ان کے خیالات ہوا و ہوس سے پاک تھے۔ وہ نہایت سرگرم ریفارمر اور باخدا بزرگ تھے ۔۔۔ آج بھی ان کی صداقت کامیابی کے ساتھ نظر آتی ہے۔"

"ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کا شعار سچائی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور جو فطرتاً بے لوث اور سچے ہوں۔"

("Heroes & Hero worship")

مارکس ڈاڈ "حضرت محمدؐ کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا آپ کے نزدیک دنیاوی وجاہت کوئی چیز نہ تھی۔ آپ امیر و غریب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ آپ کی ذات سرچشمۂ خیر و برکت تھی۔ آپ نہایت صابر اور انکسار پسند تھے۔" (محمدؐ بدھؑ اور مسیحؑ)

کاؤنٹ ٹالسٹائی حضرت محمدؐ ایک اولوالعزم اور اعلیٰ ریفارمر تھے آپ میں ایسی برگزیدہ قوت پائی جاتی تھی۔ جو قوت بشری سے بہت زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے۔"

پرکاش دیو حضرت محمد صاحب بانی مذہب اسلام۔ منجملہ ان بزرگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے قانونِ قدرت کے مطابق جہالت کے زمانے میں پیدا ہو کر دنیا میں بہت کچھ صداقت کی روشنی کو پھیلایا ۔۔۔ اور بہت سے لوگوں کو روحانی اور دنیاوی ترقی کا رستہ دکھایا۔" (سوانحعمری حضرت محمدؐ صاحب)

اس عظیم الشان ریفارمر اور جاہ و جلال کے نبی کے ساتھ محبت رکھنے کے بدلے میں جو صلہ ملتا ہے وہ ایک ہندو کی زبانی سنیے۔

ہندو سمجھ کے مجھ کو جہنم نے دی صدا
جب پاس میں گیا تو نہ مجھ کو جلا سکا
بولا وہ تجھ پہ کیوں نہ میری آتش کا ہو اثر
کیا وجہ تجھ پہ قابو مرا شعلہ نہ پا سکا
کیا نام ہے تو کون ہے مذہب ترا ہے کیا
حیران ہوں میں عذاب تجھ تک نہ جا سکا
میں نے کہا یہ جائے تعجب ذرا نہیں
واقف نہیں تو میرے دلِ حق شناس کا
ہندو ہوں میں مگر ہوں ثنا خوانِ مصطفیٰؐ
اس واسطے نہ شعلہ ترا مجھ تک آ سکا

آخر میں میں کہونگا کہ ہم سب کو دعا کرنی چاہیئے کہ خدا ہمارے دل میں اس جاہ و جلال کے نبی کی محبت پیدا فرمائے جس کی تعریف میں دشمن بھی رطب اللسان ہے۔ فَاللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ؕ

انعام قریشی
بی اے سال اوّل

"انسانی تخیل کی سحر کاریاں"

انسان جب تخیّل کے گرداب میں غوطے لگاتا ہے تو پھر وہ ایک بغیر بادبان کشتی یا شتر بے مہار کیطرح جدھر مُنہ دھرتا ہے چل نکلتا ہے اور تخیلات کی دنیا میں بہتا ہُوا کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے دنیا کے حقائق اور قرینِ قیاس باتوں سے بالکل کنارہ کش ہو جاتا ہے اسی کو تخیل کی سحر کاری کہتے ہیں۔ تخیل کی سحر کاری یہی ہے کہ ہم ناممکنات کو ممکنات کر دکھائیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی شاعر کو مسلمہ حقائق کے باطل ہو جانے کا احساس تک نہ ہو۔

تخیّل ایک حسن کی طرح ہے لیکن اس میں حقیقت کے پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اسی فلسفہ کے زیرِ اثر انسانی تخیل جب خیالاتی دنیا میں کشمکش کرتا ہے تو خلافِ قیاس باتوں کو قرینِ قیاس ثابت کر دیتا ہے اور ہمیں اس کارکردگی پر خراجِ تحسین ادا کرنا پڑتا ہے۔

؎ اگر ہم قدرت کی کرشمہ سازی پر ایک دُور رس نظر دوڑائیں تو دیکھتے ہیں کہ خدائے ذوالجلال نے آسمان پر ایک نظامِ شمسی قائم کیا ہُوا ہے۔ سورج چاند ستارے آسمان کی سطح پر بے شمار تعداد میں گردش کرتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ سورج اور چاند کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک دل برداشتہ انسان اور دل گرفتہ انسان غم و الم اور یاس و مایوسی کی سیاہ چادر اسی مہر و ماہ کی روشنی میں اتار پھینکتا ہے اور ہر قسم کے آفات سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے۔ یہی مہر و ماہ انسانی زندگی میں ایک موڑ کی اطلاع دیتے ہیں اور انہیں اندازوں کے ساتھ انسان اپنے مستقبل اور ماضی کے گذرے ہوئے حسین لمحات کا موازنہ اپنے حال کے حسین لمحات سے کرتا ہے۔۔۔۔

ایک کسان اسی مہر و ماہ کی کرشمہ سازی کے طفیل جب اپنی فصل کو تیار دیکھتا ہے تو قدرت کی اس کرشمہ سازی پر اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگتا ہے اور آخر کار خدا کی قدرت پر اس کو کامل یقین پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔۔

مگر نظیر اکبر آبادی نے اپنے زورِ تخیل سے اس حقیقت کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لئے
وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

؎ شراب کو خدا تعالےٰ نے قرآن مجید میں اُم الخبائث کے نام سے موسوم کیا ہے کیونکہ حقیقت ہے کہ

شراب ہی تمام بدیوں کی جڑ ہے۔ اور اس کے کثرتِ استعمال سے حواس معمول کے مطابق کام کرنے سے جواب دے دیتے ہیں۔ اور جب حواس ہی نکمے ہو گئے تو پھر انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا جس طرح خنزیر کے متعلق قرآنی احکام شدید سخت ہیں شراب کے متعلق احکام میں بھی وہی سختی پائی جاتی ہے اور اس طرح شراب کا ایک قطرہ بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ مگر شاعر نے اپنے زورِ تخیل سے شراب کو ایک بہت بلند رتبہ عطا کیا ہے۔ ؎

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

؎ دورِ حاضر میں انسان اپنی ترقی کی منزل پہ گامزن ہے۔ اور اس کا مقصدِ حیات بھی یہی ہے کہ ہر حیلے بہانے سے اس کا نام اوراقِ پارینہ پہ سنہری حروف سے لکھا جائے۔ اور اس کی عظمت کو چار چاند لگ جائیں۔ جیسے ایک شاعر کہتا ہے ؎

بیٹھ رہیں ایک دو ہاتھ میں رہیں
تاکہ لوگ نواب صاحب کہیں

مجھے یاد ہے ملکہ آپ نے بھی ہمارے ادبی مجلہ میں سرقہ کی ایک ناکام کوشش" کے عنوان سے ایک مضمون دیکھا ہوگا جس پر مضمون نگار نے اپنی سرقہ کی کہانی قلمطراز کی ہے کہ کس طرح اس نے حقیہ طور پہ ایک مضمون کو اپنے نام پر چھپوانے کی کوشش کی۔ تاکہ اس کا نام ادبی مجلہ میں چھپ سکے۔ اور تاکہ وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ایک ادیب کی صف میں شامل ہو سکے یہ الگ بات ہے کہ راز فاش ہونے سے تمام کیے دھرے پہ پانی پھر گیا۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی بھی انکاری نہیں ہے کہ اس دنیائے فانی میں انسان کی جد و جہد اسی پر مرکوز ہے کہ اس کا نام روشن ہو۔ اور لوگ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ مگر یہاں پہ شاعر اپنے تخیلاتی سوچ بچار میں بالکل حقیقت سے دور ہو گیا ہے ذرا تخیل ملاحظہ ہو ؎

مجھے کچھ اور بھی کم بخت کے سوا کہیئے
کہ یہ لفظ ازل سے میرے خطاب میں ہے

؎ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ایک دفعہ نہیں بار بار فرمایا ہے کہ جو میری اطاعت اور میرے رسولؐ کی اطاعت نہیں کرتا۔ وہ جہنم کا وارث ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایک جگہ جہنم کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں "جہنم اللہ تعالیٰ کی لگائی ہوئی آگ ہے جو کہ دلوں میں بھڑکتی ہے اور یقیناً وہ ان پر تیز کی جائے گی لمبے لمبے ستونوں میں" اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "کہ گنہگار اپنے مونہوں کے بل دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے"۔

توبہ توبہ۔ کتنا وحشت ناک اور دردانگیز وہ نظارہ ہوگا۔ مگر اکبر الہ آبادی کے زورِ تخیل نے اس بات کو بھی سہل کر دکھایا ہے۔ ؎

بولا جھنجلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

؎ زندگی نے ایک خاص نظام اور پروگرام اور مقصد کے تحت جنم لیا ہے اور اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے انسانی کشتی اپنی آخری منزل کو حاصل کرنے کے لیے رواں دواں ہے

اس انسانی کشتی کے ناخدا کو اگر طوفان خیز تلاطم اور طوفان باد و باراں کا سامنا بھی کرنا پڑے تو وہ اس کشتی کو ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ لئے چلتا ہے مگر رفتار میں فرق نہیں آنے دیتا۔ اور وہ اپنے مقصدِ حیات کو حاصل کرنے کے لئے اپنی سر توڑ کوشش کرتا ہے اور اسی جد و جہد میں وہ اپنے مقصدِ حیات کو حاصل کر لیتا ہے مگر اکبر الہ آبادی کے تخیل کا رنگ ملاحظہ ہو۔ ؎

چار دن کی زندگی میں کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھولیا

★ ساز و سامان انسانی زندگی اور اس کی جاودانی کے لئے از حد ضروری ہے نہ معلوم اس کی خاطر انسان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہزاروں اسی مال و دولت کے نشے میں تختۂ دار پر لٹکائے جاتے ہیں۔ اور اسی مال و دولت کی حرص انسان کو شیروں کی کچھار میں بھی گھسنے پر مجبور کرتی ہے وہ صحراؤں کی خاک چھانتا ہے۔ اور سمندر کی مہیب موجوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ مہیب تاریک اور گھنے جنگلات میں تگ و دو میں مشغول رہتا ہے.... کیوں؟ ..... مال و دولت کی خاطر۔

مگر حضرتِ داغ کی تخیل کی سحر کاری ملاحظہ ہو کہ اس حقیقت سے ہزاروں کوس دور جا پہنچے ہیں۔

نہ لٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اسی طرح کا تخیل نظیر نیشاپوری نے بیان کیا ہے۔

بہ عریانی ازاں شادم کہ از تشویش آزادم
گریبانے ندارد ناکسے از دست من گیرد

★ جب خزاں کے بعد بہار آتی ہے تو پژمردہ چہرے گلاب کی طرح کھل جاتے ہیں ہر کس و ناکس اس معجز نما سماں کی لطافت اور حلاوت سے مستفید ہوتا ہے ہر دل گرفتہ شخص ان بہاروں میں ماتم و مایوسی کی چادر کو پھینک دیتا ہے اور رنج و الم کی تمام زنجیروں کو توڑ دیتا ہے وہ باغات میں چہچہاتے ہوئے پرندوں سے بھی اپنے آپ کو زیادہ مسرور پاتا ہے جیسے اس نے اپنی آخری منزل کو پا لیا ہو۔ مگر حضرت اصغر ابنالوی کے تخیل کی یہ بہار ملاحظہ ہو ؎

جگر کے زخم پہ نظر اپنی مدام رہی
کبھی بہار کے ہمراہ مسکرا نہ سکے

اسی طرح حضرت میر کے تخیل کی جادو سرائی بھی ملاحظہ ہو

بقائے لالہ و گل میں جھلک رہی تھی خزاں
بھری بہار میں رویا کئے بہار کو ہم

★ "کونین" کے متعلق عام بچوں میں یہ روایت ہے کہ خواہ وہ بخار سے پھنک کیوں نہ رہے ہوں۔ مگر جب ان کے نزدیک کونین کا ذکر آتا ہے تو یوں ان کے دل و دماغ پر کونین کا اثر چھا جاتا ہے کہ تمام بخار کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

مجھے بھی کونین کے نام سے کافی چڑ ہے۔ جب کبھی کونین کا نام سنتا ہوں سنانے والے کو نہ معلوم دبی زبان میں کیا کچھ کہہ جاتا ہوں۔ ..... جب کبھی ہسپتال جانے کا اتفاق ہوتا ہے..... اور

ویسے خدا کسی کو ہسپتال کا رستہ نہ ہی دکھائے تو بہتر ..... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بفرضِ محال اگر میں ہسپتال چلا جاؤں اور مجھے ڈسپنسر کی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر کوئی دوا لینے کی ضرورت پیش آئے تو ایک نظر ڈسپنسر پر ہوتی ہے اور دوسری نظر بوتلوں کے نمبروں کی طرف۔ اور اگر ڈسپنسر کو بوتل ۱۹ کی طرف حرکت کرتے دیکھ لوں تو دل تھام کے رہ جاتا ہوں۔ سر چکرانے لگتا ہے .....

مگر حضرتِ داغ کا ذوقِ تخیل ملاحظہ ہو:۔

کونین جس کے ناز سے چکرا رہے ہیں داغ
ہیں ہوں بے نیاز اسی روزگار کا

یہ ہیں انسانی تخیل کے کمالات اور سحر کاریاں جنہوں نے ہمارے دل و دماغ، احساسات، جذبات اور روحانیات پر ایک عجیب کیفیت طاری کی ہوئی ہے اور ہم تخیل کے ان کمالات اور احساسات کے بوجھ تلے کچھ یوں دب جاتے ہیں کہ بالکل غلاف عقل باتوں کو قرینِ قیاس سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ ایسا کرتے وقت ہم کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم ناممکنات کو ممکنات سمجھ رہے ہیں۔ حقیقت سے بالکل دور ہونے کے باوجود ہم شاعر یا ادیب کے فکر خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور یہی تخیل کی سحر کاری ہے

بقیہ ایک سرد رات

اس وقت مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ اور میں نے آگے بڑھ کر بوڑھے سے اس کا حال پوچھا؟

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بالکل خاموش رہا۔ اس کی متجسس نگاہیں نہ جانے کسے ڈھونڈ رہی تھیں ـــــ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ سو گیا ـــــ اور میں وہاں سے اٹھ کر گھر آیا ـــــ گھر پہنچ کر بھی مجھے اس بوڑھے کا بار بار خیال آتا رہا ـــــ اور اس کی حالت کا خیال کر کے میرا دل بھر آتا ـــــ

صبح سویرے ہی میں اٹھا اور ناشتہ سے جلدی جلدی فارغ ہو کر سیدھا ہسپتال پہنچا۔ کیونکہ میں اس بوڑھے کا حال جاننے کیلئے بیتاب ہو رہا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے جب مجھے بتایا۔ کہ مریض رات ہی چل بسا ـــــ تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میرا دل غم کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ میں بغیر کچھ کہے سیدھا بوڑھے کے کمرے میں پہنچا ـــــ اس کا چہرہ اس وقت پرسکون اور شاد تھا ـــــ شاید اس لئے کہ اس نے مر کر اس دنیا کے مظالم اور دکھوں سے نجات حاصل کر لی تھی ـــــ اور اسے ایک ابدی راحت مل گئی تھی ـــــ اب بھی جب کبھی یہ واقعہ مجھے یاد آتا ہے تو میرا دل کانپ اٹھتا ہے ـــــ یہ دنیا غریبوں کے لئے کتنی بیدرد ہے ـــــ میں اس سرد رات کو آج تک نہیں بھول سکا ـــــ وہ سرد رات جس میں ایک غریب۔ اور لاچار انسان نے اپنی جان دی تھی ـــــ وہ سرد رات!!

اظہر سلیم صدیقی
ایف ایس سی (سال اول)

ایک حقیقت ایک افسانہ

ٹھہرا ہوا

میٹرک کے بعد جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تو اس فضا کو سکول کے ماحول سے بالکل مختلف پایا۔ سکول میں طلبہ براہِ راست اساتذہ کرام کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ مگر کالج میں اس کے برعکس خود طالب علم کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے آگے قدم بڑھانا ہوتا ہے۔ پہلے روز میں کلاس روم میں آ کر ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ نئے نئے اجنبی چہروں کی کمرے میں آمد شروع ہو گئی۔ اتنے میں اچانک ایک دلکش خدوخال اور متبسم چہرہ والا نوجوان اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوا۔ اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لیکچرار صاحب تشریف لائے۔ لیکچر دیا اور چلے گئے۔ پیریڈ کے بعد میں اس نوجوان سے متعارف ہوا۔ میرے اور اس کے مضامین ایک ہی تھے باہم بے تکلف ہو گئے۔ سب پیریڈ اکٹھے گذرتے۔ خالی اوقات میں لائبریری میں چلے جاتے۔ کبھی کبھا ٹک شاپ کی زیارت بھی کر لیتے۔ میں دارالاقامہ میں رہتا تھا۔ اور وہ باہر شہر میں۔

دن ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے ہماری دوستی رفتارِ زمانہ سے بھی زیادہ تیزی سے مستحکم ہوتی چلی گئی۔ مگر بھلا ہوا حاسدوں کا کہ کبھی دو دلوں کو آپس میں ملتا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔ ہم کلاس میں داخل ہوتے تو لڑکے ہنسنے لگتے۔ کوئی کہتا "آ گئے دیوانے"! ادھر سے کوئی پکارتا "نہیں صاحب! پاگل"۔ مگر ہم ہنس دیتے کہ انہیں دوستی کی قدر ہی کیا معلوم!! اساتذہ کرام بھی جب ہم میں سے ایک کو غیر حاضر پاتے۔ تو دوسرے سے پوچھتے۔ کہ آج تمہارا دوست کدھر گیا۔ پیشتر اس کے کہ ہم جواب دیتے۔ کلاس ہنس دیتی۔ وہ بلاناغہ میرے پاس ہوسٹل آیا کرتا۔ دیر تک خوش گپیوں کا دور چلتا۔ دن اسی طرح گذرتے گئے۔ دسمبر ٹسٹ قریب آ گیا۔ "پڑھی" تو نہیں خوش گپیاں، کامیابی بھی ویسی ہی امید ہوتی تھی۔

دسمبر ٹسٹ کے بعد چھٹیاں ہوئیں تو وہ مجھے ملے بغیر چلا گیا۔ مجھے افسوس ہوا کہ نہ جانے جو ایک پل بھی مجھ سے جدا ہونا گوارا نہ کرتا تھا کیسے بغیر ملے چلا گیا۔ خیر چھٹیاں گذار کر میں واپس آیا۔ مگر کالج میں جب میں نے اسے دیکھا تو وہ بجائے اس کے کہ مجھے ملتا۔ کنارہ کر گیا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح تو اسے بلا کر اس بے التفاتی کا سبب دریافت کروں مگر وہ مجھ سے اتنا ہی دور ہوتا

چلا گیا۔ جتنا کہ میں اُسے غریب سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس کا خیال دل سے نکال دیا۔

ایک دن غیر متوقع طور پر وہ میرے کمرہ میں (جبکہ میں تنہا تھا) آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت ہینڈ بیگ تھا۔ خوشی سے میری آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بےساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "کدھر سے آج عید کا چاند نکل آیا۔" مگر پیشتر اس کے کہ وہ میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتا۔ ہینڈ بیگ میرے آگے پھینکتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ لو اپنی امانت۔" "امانت! آہ ظالم تو نے یہ کیا کہا؟ اتنی سنگدلی! یہ امانت تھی!! یہ تو وہ تحفہ ہے جو میرے خلوص کا ایک ادنٰے اور حقیر سا مظاہرہ تھا۔ تیری اس سرد مہری کی کیا وجہ ہے؟ افسوس کہ اتنی اخلاص سے پروان چڑھی ہوئی دوستی دم بھر میں تیری بے وفائی کا نشانہ بن گئی۔" اس واقعہ کے بعد کالج میں اس نے کبھی بھول کر بھی مجھے نہ بلایا۔

دسمبر ٹسٹ کا نتیجہ نکلا تو میں بمشکل ہی پاس ہو سکا۔ یہی حال اس کا تھا۔ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ چلو پاس تو ہو ہی گئے۔ مگر اس نتیجہ کو دیکھ کر خیال آیا کہ "او نابکار انسان! تو نے کیوں ناحق اپنا بیش قیمت وقت فضول گپوں اور ریستورانوں کے چکروں میں ضائع کیا۔ ایسی دوستی سے تو اکیلا ہی بھلا تھا جس میں تو اپنے بوڑھے باپ کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی پونجی سے کھیلتا رہا۔"
یہ ردِ عمل میری زندگی کا ایک سُنہرا موڑ ثابت ہوا۔ اس وقت میں سمجھا کہ "اس مطلب کے زمانہ میں کسی کو دوست سمجھ بیٹھنا نادانی سے بڑھ کر کچھ نہیں یہ زمانہ تو ایک "سراب" ہے۔ جس کے دھوکے میں پڑ کر انسان ذہنی سکون سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کیوں نہ میں پہلے ہی یہ حقیقت جان چکا ہوتا کہ میرا مخلص ترین دوست وہ...... نہیں تھا۔ بلکہ میری اپنی کتابیں میری جاں نثار دوست ہیں۔ جو یاس و الم کے اندھیرے بادلوں میں بھی رفاقت نہ چھوڑتے ہوئے امید کی کرن کی جانب رہنمائی کرتی ہیں۔"

بقیہ: آہ غریب ...

جھولی بھرے ہوئے امیر کے محل سے باہر نکل آیا ادھر طوفان کے زور سے اچانک صدیوں پرانے فلک بوس پیپل کے درخت جو اس کے محل کی زینت سمجھے جاتے تھے جڑوں سمیت اکھڑ گئے۔ ان درختوں کے تنوں کا منوں بوجھ جب محل کی دیواروں پر پڑا تو ان میں کئی دراڑیں پڑ گئیں اور عین اس وقت محل پر گرے ہوئے درختوں پر بجلی پڑی۔ اور اس تمام جاہ و حشمت کو ان مالکوں سمیت خاکستر کر گئی۔ جنہیں کبھی بھولے سے بھی اس بات کا احساس نہ ہوا تھا کہ ان کا بھی ایک حاکم ہے۔ جو سمیع و بصیر ہے۔

طاہر احمد جاوید
ایف۔ ایس سی

★ ایک سرد رات ★

دُور گھڑیال کو جب میں نے دس بجاتے ہوئے سُنا۔ تو میرے قدم خود بخود تیز اٹھنے شروع ہو گئے کیونکہ آج خلاف معمول مجھے ٹیوشن پڑھ کر واپس آنے میں کافی دیر ہو گئی تھی ——

سردیوں کی سنسان رات تھی۔ کہیں کہیں کوئی راہ گیر سڑک پہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا نظر آتا تھا —— ہوا کے سرد جھونکے میرے جسم میں کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ اگرچہ میں نے گرم کوٹ وغیرہ پہن رکھا تھا —— مگر پھر بھی مجھے شدید سردی لگ رہی تھی —— اس دن ویسے بھی خلاف معمول کچھ زیادہ ہی سردی تھی ——

آسمان پر ستارے اس طرح جھلملا رہے تھے جیسے وہ بھی سردی سے ہی کانپ رہے ہیں —— میں اپنے خیالات میں مگن سڑک کے کنارے کنارے گھر کی طرف بڑھا جا رہا تھا —— دور سے جب میں نے گلی کو، جس میں ہمارا مکان تھا، دیکھا تو مجھے ایک انجانی سی خوشی ہوئی —— اور میرے قدم پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہی تیز اٹھنے شروع ہو گئے —— آخر میں سڑک کو چھوڑ کر اندھیری گلی میں داخل ہو گیا —— لیکن —— میں ابھی چند ہی گز کے فاصلے پر گیا تھا کہ ایک کالی سی حرکت کرتی ہوئی چیز کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے —— میں گھبرا کر پیچھے کی طرف بھاگنے ہی والا تھا کہ میں نے ایک کراہ سُنی —— ہمت کر کے ذرا آگے بڑھا —— کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھا پھٹے ہوئے کپڑوں میں اوندھے منہ زمین پر پڑا ہے۔ اور اس کے ناک اور مُنہ میں سے خون بہہ رہا ہے —— یہ رُوح فرسا منظر دیکھ میرے دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات اُبھرنے لگے۔ اور میرے قدم خود بخود اس کی طرف بڑھنے لگے —— میں نے اسے سیدھا کیا۔ اور اپنے رُومال سے اس کا خون صاف کرنے لگا۔ پھر یہ سوچ کر کہ یہ بیچارہ سردی سے کہیں مر ہی نہ جائے میں بھاگتا ہوا گھر گیا۔ اور جلدی سے ایک کمبل لیکر دوبارہ وہاں آیا —— میں اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اسے کمبل میں لپیٹا اور اٹھا کر نزدیکی ہسپتال میں لے گئے۔ اس وقت وہ بوڑھا بالکل بیہوش تھا —— اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو اس کی تمام کہانی بیان کر رہے تھے —— غربت اور مظلومی کی۔ ڈاکٹر نے فوراً اسے ایک انجیکشن دیا —— اور ہمیں تسلی دی کہ حالت قدرے ٹھیک ہے ——

آخر دو گھنٹے کے بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں

(باقی دیکھیں صفحہ ۶۰ پر)

ناصر احمد طاہر
ایف۔ اے۔ فاضل

پیکرِ عزم

مابدولت اور مابدولت کے ایک نہایت جگری جگری دوست جناب ثاقب ایک دن چوغۂ صیادی پہن کر تفریح طبع کے لئے شہری علاقہ سے دُور ایک وادی میں جا پہنچے۔ اس علاقہ کا کیف آور سماں دیکھکر دنگ رہ گئے۔ دور سے چلچلاتی دھوپ میں چلکر آئے تھے۔ یہاں سڑک پر دو رویہ سبز درختوں کا گھنا ٹھنڈا سایہ پایا۔ دل تشکر و امتنان کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ خوبصورت پرندے میٹھی بولیاں بولتے سُنے۔ کسان رہٹ چلا رہے تھے اور پانی پتھروں سے سر پٹکتا۔ جھاگ اُڑاتا اور مچلتا ہوا کیاریوں میں ناگ کی طرح بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔

یہاں سے تھوڑی دور ایک خوبصورت اور پُر رونق گاؤں نظر آ رہا تھا۔ گاؤں کے مسحور کن نظارے کو دیکھکر بے اختیار زبان سے یہ شعر نکلنے لگا ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

فیصلہ ہُوا کہ یہیں ڈیرا ڈالا جائے۔ خوابوں کی دُنیا بیداری میں دیکھی۔ سب سے پہلے گاؤں کی مسجد میں گئے نمازِ عصر ادا کی۔ گاؤں کی رونق اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی مسجد کی چمک ہمیں متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ فوراً خیال پیدا ہُوا کہ اس گاؤں کی تاریخ کو جاننا چاہیئے۔ چنانچہ ایک بزرگ سے پوچھنے پر معلوم ہُوا کہ اس گاؤں کا ماضی بہت تاریک ہے۔ اس کا حال البتہ ایک مردِ مجاہد کی شب و روز کی سعی و کوشش سے منور ہو گیا ہے۔ ہمارے دل میں اس مردِ مجاہد سے ملاقات کی خواہش چٹکیاں لینے لگی۔ معلوم ہُوا کہ وہ ہمارے پرانے اور مخلص دوست "صوفی ارشد علی صاحب" ہیں۔ دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سوچا کہ "ملاقات" بھی ہو جائے گی اور رات بھی ان کے پاس بسر کریں گے گھر کا پتہ پوچھا اور فوراً وہاں پہنچ گئے۔ دستک دی۔ اندر سے ایک خوش اخلاق اور مؤثر آواز آئی "کون صاحب؟" آواز ہمارے دل میں مسرت کے ساز کو چھیڑتی ہوئی گذر گئی۔ ارشد صاحب کے بارے میں دریافت کرنے ہی کو تھے کہ دوسری جانب ایک جوان سال نوجوان پر نگاہ پڑی جو مسکراتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔

ارشد نے آتے ہی ہمیں پہچان لیا اور بڑی گرمجوشی سے باری باری بغلگیر ہُوا۔ "ڈرائنگ روم" میں جا کر بیٹھ گئے۔ پھر کچھ دیر تک رسمی بات چیت ہوتی رہی۔

ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ ماضی کی حسین یاد اور خوشی کے وہ لمحات

جو ہم نے اکٹھے بسر کئے تھے ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے یہ رقص کتنا فرحت زا تھا اس کی کیفیت صاحب حال ہی بتا سکتا ہے۔

میٹرک کے بعد ارشد ہم سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ لیکن تاتب کالج لائف میں بھی میرے ساتھ ہی رہا تھا ارشد سے ایام جدائی کی آپ بیتی سنانے کو کہا گیا تو وہ بے تکلف یوں گویا ہوئے۔

"میری پندرہ بیس برس کی محنت برائی "بی اے" میں اول رہا۔ ملک میں تعلیم کم تھی۔ جگہ جگہ سے میری ملازمت کے لئے "کالز" آنے لگیں۔ مجھے ملازمت پسند نہ تھی۔ چاہا کہ کسی پُرسکون فضا میں بیٹھ کر زندگی بسر کروں۔ اور اہل دنیا سے کچھ مطلب نہ رکھوں لیکن حالات زمانہ نے یہ خیال میرے دل سے نکال دیا۔ اور پھر یہ سوچا کہ خدا تو حاجات سے بالا ہے حمد وثنا سے بے نیاز ہے۔ سورج، چاند، ستارے غرض سب سجدہ ریز ہیں۔ اگر میں تا قیامت اس کے سامنے سر بسجود رہوں تو اس کی شان میں کیا اضافہ ہو جائے گا کیا میرے لئے مناسب نہ ہوگا۔ کہ حاجت مند مخلوق کے کام آؤں۔ چنانچہ میں نے گاؤں کے باہر ایک پرانی مسجد میں مکتب کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اسی اثنا میں اللہ جانے سسرال والوں نے کیا مصلحت سمجھی "چھٹ منگنی پٹ بیاہ" کی ٹھہرائی۔ میں نے یہ سوچ کر قبول کر لیا۔ کہ زندگی کی کٹھن منزل میں ایک اکیلا دو گیارہ ہیں۔ مشترکہ کوششوں سے بڑی سے بڑی مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔

" بیوی کو خوشی خوشی گھر لایا۔ لیکن جلد معلوم ہو گیا کہ بیوی کیا ہے مصیبت ہے۔ اس نے مکتب کے اجراء کی خبر سُنی۔ اپنے بال نوچے میری ڈاڑھی پکڑ لی کہ بھلے ہو تو کوئی ٹھاٹھ کی ملازمت کرو۔ ورنہ کچھ چاٹ مروں گی۔ یا کسی طرف نکل جاؤں گی۔ میں شماتتِ ہمسائیگان کے خوف سے آہستہ آہستہ بات کرنا چاہتا۔ وہ آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ اور ہمسایوں کو بلاتی۔ ایک روز ایسا ہی ہوا۔ شور و شغب سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ بڑی تشہیر ہوئی۔ پیچھا چھڑا کر اندر جا لیٹا۔ لوگ اپنے کام کاج کو چلے گئے۔ لیکن وہ آفت کی پرکالہ میرے سر پر آ۔ کم بخت بولی۔ "ہوں۔ تجھ مولوی کو بندہ بنا کر چھوڑوں گی"۔ میں پھر شماتتِ ہمسائیگان سے خاموش رہا۔ جب سو گئی تو رات کے اندھیرے میں اُٹھا مسجد میں جا کر قضا نمازیں ادا کیں۔

عقل نے کہا عورت کی مان لو۔ ایمان بولا۔ کارِ خیر میں عجلت کرو۔ میں نے بھی "ادھر سے نہ ہمت پسارے نہ رام" کے مقولہ پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بہزار خواری اور لاکھ زاری کے بعد اس نیک بخت نے میرے عزم میں اس شرط پر حائل نہ ہونا قبول کیا کہ وہ پاؤں پسار کر سوئے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھے اور اس کا کام کاج کوئی باندی کر دیا کرے۔

ماننے کو تو مان گیا مگر بلا معاوضہ لونڈی کہاں سے لاتا۔ لاچار ہو کر فیصلہ کیا کہ گھر کا کام کاج کرنے میں مجھے کیا عار ہے۔

چند چند شام کو پانی لانے رات کو چکی پیسنے لگتا۔
صبح کو اندر باہر صفائی کرتا۔ آگ جلاتا۔ کھانا پکاتا خود کھاتا۔ اس کو کھلاتا اور پھر بچوں کو سبق دینے مکتب چلا جاتا۔

"ساون کی ایک شام آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ پانی بھرنے کے خیال سے باہر نکلا بادل میری قسمت اور حال پہ پسیج اٹھا وہ اس قدر رو دیا کہ میرے کپڑے بھیگ کر شرابور ہو گئے۔ کپڑے بدل رہا تھا کہ ہوا لگ گئی۔ حرارت ہو گئی۔ شدتِ بخار سے بیہوش ہو گیا۔ رات کے تقریباً بارہ بجے تکلیف کی آہیں اس نیک بخت کے کانوں تک پہنچیں اور اس اللہ کی بندی نے پوچھا کیوں ـــ کیا ہے؟ میں نے جواب دیا "بخار"۔ "میرے سر میں بھی درد ہے" یہ کہکر پھر سو گئی۔

تین بجے کے قریب شدتِ عطش سے زبان تالو سے لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھر جاگ رہی ہے۔ تو پکارا "اے بی بی! ـــ ذرا پانی دینا"۔ "میں دردِ سر کی وجہ سے رات بھر سو نہیں سکی۔ اٹھ کر پی لو" یہ کہکر آہیں بھرنا شروع کر دیں۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ پانی پیا اور صبر و شکر کیا۔ پھر اس کا سر دبانا شروع کیا لیکن ابھی ایک بھی منٹ نہ گذرا ہوگا کہ میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔

صبح ہوئی تو میرا کندھا ہلا کر بولی کہ صبح کے لئے آٹا تو ہوگا شام کے لئے نہیں ہے اٹھ کر پیستے کیوں نہیں۔ تمہاری تو طبیعت ناساز ہے مگر مجھے تو کوئی مرض نہیں ہے پیٹ کا دوزخ کس طرح بجھاؤنگی؟

میری بخار کی تپش دیکھکر کچھ دیر توقف کیا۔ کچھ سوچکر وضو کر کے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر میری صحت یابی کے لئے دعائیں کرنے لگی۔ دن بھر میری تیمارداری میں لگی رہی۔ ایک ہی دن کی تیمارداری سے میرا بخار اُتر گیا۔

اگلے دن صبح کو جب میں رو بصحت ہو کر بستر سے اٹھا تو وہ نیک بخت بے اختیار میرے پاؤں پر گر پڑی اور سابقہ خطاؤں کی معافی چاہی۔ میں نے اس کی فطرت میں بیداری کو اپنی مدتِ امتحان کا خاتمہ سمجھا۔ اور اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ خدا نے مجھ پر مہربانی فرماتے ہوئے پتھر دل کو موم بنا دیا۔

اب اس نے گھریلو کام کاج کے علاوہ مکتب کی ترقی کے لئے بھی میرا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ہماری متحدہ کوششوں اور نصرتِ الٰہی کی بدولت نونہال پودے پروان چڑھنے لگے جن کا بیج میں نے اس مکتب میں بویا تھا۔ اور یہ گاؤں جو تاریکی کے اندھیرے گڑھوں میں زندگیاں گذارنے والے لوگوں سے آباد تھا۔ اب بدرِ منیر کی طرح منور ہے"۔

ہم ارشد کی بامقصد زندگی کی داستان سنکر بہت خوش ہوئے۔ اور "ہمت مرداں مددِ خدا" کہکر اس کی کٹھن مگر نتیجہ خیز مساعی کی داد دی۔

ہمت کرو عزیزو ہمت سے کام ہوگا!
کہتے ہیں بخت جس کو وہ خود غلام ہوگا

افسانہ

محمد یوسف بلوچ
سالِ دوم (الیف ایس سی)

"آہ غریب کچھ نہیں پایا ظلم سہتے سہتے"

آج فلک بادلوں کی نرم چادر اوڑھے ہوئے ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور پُرلطف ہوا چل رہی ہے۔ میں ندی کے کنارے ان شبو کے پودوں میں بیٹھا ہوا ہوں۔ جو میرے غمگین لمحاتِ حیات کو پُرلطف اور پُرسکون زندگی میں بدل دیا کرتے تھے۔ شبو کے پھولوں کی مہک نے سارے باغیچے کی فضا کو معطر بنا رکھا ہوا ہے۔

آج میں بہت اُداس ہوں اور یہ تمام یادیں مجھے خوش نہیں کر سکیں۔ ہاں وہی یادیں۔ جن سے میں اپنے غموں کو بھول جایا کرتا تھا۔ ہاں وہی شبو کے پھول جن کی مہک میرے زخمی دل پر مرہم کا کام دیا کرتی تھی۔ اور ہاں وہی یادیں جنہوں نے مجھے آسمان میں پرواز کرنا سکھایا تھا۔

افسوس وہ سب آج میرے غمگین اور بےچین دل کو خوشی اور سکون عطا کرنے سے قاصر ہیں۔
میں نے کل کے واقعات کو بھول جانے کی کوشش کی مگر نہ بھول سکا۔ کیوں؟ اس لئے کہ کل میری آنکھوں کے سامنے انسانیت کو کچلا گیا۔ اخوت و مواخات کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ دولت کا سہارا لے کر غریبوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا ان سے ان کے جینے کا حق چھین لیا گیا۔ ان سے یہ حق اس لئے چھین لیا گیا تھا کہ وہ غریب تھے ان کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ وہ اپنے بچوں کو پہنانے کے لئے کپڑا مہیا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن وہ ان تمام حالات کے باوجود امیروں کی خدمت بغیر کسی معاوضے کے کیا کرتے تھے۔

ایک روز صبوری بچارے کو محض اس لئے سزا دی گئی۔ کہ اس نے اپنے آقا کے کتے کی جگہ کو وقت پر صاف نہ کیا۔ اور کل نہ صرف اس کے باپ کو اس کی زندگی سے محروم کیا گیا تھا بلکہ اس کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ صبوری چیختا۔ پکارتا۔ رحم کی درخواست کرتا۔ معافی مانگتا۔ لیکن پتھر دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اس تمام ظلم و ستم کی وجہ یہ تھی کہ اس نے سابقہ خدمتوں اور انسانیت کا واسطہ دے کر اپنے نحیف بیمار باپ کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے چند سکوں کا مطالبہ کیا تھا — اس صدمہ کو اس کا باپ نہ برداشت کر سکا۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا
وہ اس دُنیا میں رہنا پسند نہ کرتا تھا جہاں غریبوں کے خون سے کھیلا جاتا ہے۔ جہاں دولت

سہارا لے کر غریبوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ جہاں انسانوں کے روپ میں اژدھے ہوں وحشی درندے ہوں۔ جہاں غریبوں کی آواز کو محض اس لئے دبا دیا جاتا ہے کہ وہ غریب ہیں جہاں غریبوں کو اس لئے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے کیونکہ ان کے پاس ان کی طرح عیش و عشرت کے سامان نہیں۔ ان کے پاس محلات نہیں۔ ان کو کھانے کے لئے روٹی میسر نہیں وہ ان کی طرح ظلم نہیں کر سکتے۔ وہ ان کی طرح انسانیت کو کچل کر خوش نہیں ہو سکتے۔ اور اس لئے کہ وہ مظلوم کے ساتھ مل کر آنسو بہانے سے باز نہیں آ سکتے۔

اس کے پاس اپنے باپ کو آخری پونجی دینے کو کچھ نہ تھا وہ اپنے باپ کے کفن دفن کا انتظام نہ کر سکتا تھا اس لئے وہ ان حالات میں آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ کسی امیر کے پاس جا کر دست درازی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسی وجہ سے وہ پہلے ہی مظلوم بن چکا تھا۔ وہ ان حالات میں کھویا ہوا یہ معمہ حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس معمہ کو خدا ہی حل کر سکتا تھا جو اپنے رحم سے اس کی مدد کرتا کیونکہ قلب میسر آتا۔ کسی بھی امیر نے اس کی حالت پر ترس نہ کھایا۔ اسی کشمکش و پیچ میں باہر دروازے پر دستک کی ایک آواز نے اس کی تصورات کی دنیا کو نیست و نابود کر دیا۔

اس نے جا کر دیکھا کہ باہر اس کا کوئی غریب بھائی جو اس کے پہلو میں سکونت پذیر رہا تھا۔ کچھ دام لئے کھڑا ہے۔

یہ دام اس کو بھی کئی دن فاقہ کشی کے بعد ملے تھے۔ جو خوشی خوشی گھر لے آیا تھا کہ چلو آج تو پیٹ بھر کر کھانا میسر آئے گا۔ لیکن جب اس کو اپنے غریب بھائی کی تکلیف کا علم ہوا تو اس سے یہ نہ برداشت ہو سکا۔ کہ میں تو اپنی پیٹ پوجا میں مصروف رہوں۔ جبکہ ایک غریب اور بے یار و مددگار بھائی کے باپ کو کفن بھی نصیب نہ ہو۔

صبوری باپ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر گھر پہنچا ہی تھا کہ اس کے سخت گیر آقا نے اُسے حاضرِ خدمت ہونے کے لئے بلا بھیجا اس کے لئے یہ خبر اس انسان سے کم نہ تھی جس کو اچانک اٹھا کر مصیبت کے جبڑوں کے حوالے کر دیا جائے۔

چار و ناچار اسے حاضری دینی پڑی جاتے وقت اس کے منہ سے یہ فقرے نکل رہے تھے۔

" اے رحیم خدا تو کب تک ہم پر ظلم ہوتا دیکھتا رہے گا۔ کب تک اس دنیا کو اسی ظلمت کدہ میں رکھے گا!" ع

"آہ غریب کم نہیں ظلم شہ جہاں سے کچھ"

خورشید اپنا سفر ختم کر کے افق میں چھپ گیا تھا۔ مغرب کی طرف سے ایک مہیب آندھی اٹھی آنِ واحد میں طوفانِ باد و باراں نے تمام علاقہ کو گھیر لیا۔ ہوا اس شدت کی تیز کہ اس وقت تک دیکھی نہ سُنی گئی تھی۔

غریب صبوری جھڑکوں اور سرزنش سے اپنی

(باقی دیکھیں صفحہ ۱۲ پر)

مجیب الدین امجد
بی۔اے۔ سال اول

افسانہ

حقِ دوستی

(کردار فرضی ہیں)

"ہمیشہ ہی کسی قوم کا عروج اس وقت ہوا جب اس کے ہاتھ میں کردار کی تلوار اور قربانی و ایثار کا نیزہ تھا۔ اور اس کا زوال اس وقت ہوا جب وہ شطرنج کھیلنے میں ماہر ہو گئی اور گانے بجانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ رہا۔ غالباً آئندہ بھی یونہی ہو....."

اور پھر پروفیسر صاحب اچانک رُک گئے۔

"رول نمبر سیونٹی سیون"! آپ سو رہے ہیں!!"

پروفیسر صاحب گرجے۔

تمام لڑکوں نے پچھلی نشستوں میں بیٹھے ہوئے نیاز کی طرف تاکنا شروع کیا۔ حیرانی کے عالم میں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ گویا کوئی مجرم ہو۔ اچانک اس کی نظر اپنے سامنے والے لڑکے پر آ کر رُک گئی۔ اور پھر اس نے فوراً نظریں جھکا لیں ــــ اس کے سامنے اس کا گہرا دوست اور ہم کمرہ ساتھی اعجاز بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر صاحب دوبارہ لیکچر شروع کر چکے تھے لیکن نیاز ان کا لیکچر سننے کے بجائے کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ایک ہی خیال بار بار اس کے دماغ میں آتا۔ وہی خیال کبھی تو لوہے کے گرم گولوں کی طرح اس کے دماغ سے ٹکراتا اور اس کو پگھلا دیتا اور کبھی منجمد برف کے ٹھنڈے تودوں کی طرح اس کو یخ بستہ کر دیتا۔

وہ تمام پیریڈ کسی ادھیڑبن کے چکر میں پھنسا رہا۔ گھنٹی بجی۔ کتابیں اُٹھائیں اور ہوسٹل کی طرف چل دیا۔

وہ چلتا گیا مگر اردگرد سے بے خبر۔ "پوچھیگا تو وہ آج بھی ضرور" وہ بڑبڑایا۔ "مگر میں اُسے ڈانٹ دونگا...... اسے کوئی حق نہیں کہ وہ میرے ذاتی معاملات میں دخل دے۔" اس خیال سے اس کی کچھ ڈھارس بندھ گئی۔ مگر فوراً ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے دوست ــــ ہاں اس بھرے شہر میں اس کے واحد مونس و غمگسار کی شکل گھوم گئی.....

اعجاز۔ ہر کلاس میں اوّل آنے والا اعجاز۔ کالج کا بہترین مقرر۔ ایک ہونہار کھلاڑی ایک مخلص اور ہمدرد ساتھی...... اعجاز۔ مگر جن باتوں سے اعجاز اسے روک رہا تھا وہ تو ان کا عادی ہو چکا تھا۔ ان کی لذت اسے اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ اور وہ کھنچا چلا جاتا تھا۔ کل تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سارا دن بازاروں کی پیمائش میں سرگرم عمل رہا۔ بالکل بے مطلب۔ اس کے ساتھی چلتی سڑک پر ــــ بھرے بازار میں صنفِ نازک کو نت نئے

طرفقیوں سے چھیڑتے - سب کی نظروں سے بچتے ہوئے نکل جاتے۔ قہقہے لگاتے اور بس - مگر رات تو انہوں نے حد کر دی - متواتر تین شو دیکھے تھے اور خدا جانے کیا کیا گل کھلائے تھے - اگرچہ تمام بل نیاز ہی کو ادا کرنے پڑے تھے مگر وہ بالکل نہیں گھبرایا تھا - ابھی مہینہ کا آغاز ہی تو تھا - مہینہ کا آخری ہفتہ عشرہ کیونکر گذرے گا؟ ـــ ہنوز دلی دور است - کہکر دل کو تسلی دے لی - اُسے فکر مند کرتی تھی تو صرف ایک ہی بات اس کا دوست اعجاز جسے ملنے سے وہ صبح سے کترا رہا تھا - وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب بھی وہ ملے گا - یہی پوچھے گا کہ وہ رات بارہ بجے تک کہاں رہا - اور وہ کوئی بہانہ بھی تو نہ چلنے دے گا - اس کے ٹھوس دلائل یہ ثابت کر چکے تھے کہ آوارہ گردی اور سنیما بینی ایک طالب علم کے لئے زہرِ قاتل سے کم نہیں - گو نیاز انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا - نہ معلوم کیوں اس کے دل میں یہ بات سما چکی تھی کہ وہ ایک اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا چکا ہے - اور اس وقت اس کا سنبھلنا محال ہی نہیں ناممکن ہے - اُس کی منزل تو کنوئیں کی نچلی سطح ہے - ایک روز اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا - بازاروں میں پھرنا اس کی ٹانگوں کی غذا بن چکی تھی - اور فلم بینی ...... وہ تو اس کی زندگی کا ایک جزو لاینفک تھی - فلم نہ دیکھنا نیاز کے لئے موت سے کم نہ تھا -

وقت نیاز کی سفلی خواہشات اور اعجاز کے دردِ دل کے درمیان غیر جانبدار ہو کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف چلتا رہا - اس نے گیارہ ماہ کی مسافت طے کر لی ایک حقیقی دوست ..... ہاں ایک آہنی کردار اعجاز جو اپنے ماحول کے تھپیڑوں سے کبھی متزلزل نہ ہوا تھا اپنے دوست نیاز ..... نہیں ایک گرتی ہوئی دیوار ..... کو تھامنے کی کوشش کرتا رہا - مگر بے سُود - لاحاصل ـــ دیوار کی بنیاد ہل چکی تھی اور زمانہ کی تند آندھیوں نے اسے گرانے کی ٹھان لی تھی -

کیا وہ "گولڈن واچ" اب اس کی تھی؟ نہیں اب وہ کسی اور کی ہو چکی تھی - اور پھر وہ ہیرے کی انگوٹھی جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھی - جو اس نے خود نہیں خریدی تھی - بلکہ اسے پہنائی گئی تھی - کیوں؟ کب؟ کہاں؟ اسے وہ دن ابھی بھولا نہیں تھا - ہاں تو وہی انگوٹھی اب بک چکی تھی اس نے اسے ایک دُربا دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا - اس ظالم نے اپنے پجاری کا سکون و اطمینان - دولت اور صحت سب کچھ بٹور لیا تھا - اور اب ـــ اور اب وُہ اس کے خون کا آخری قطرہ بھی پی لینے پر تُلی ہوئی تھی - وہی اس کی دیوی فلم ـــ اور وہ ایک پجاری کی طرح بے ہوش - اندھا دھند پھر اسی کی جانب جا رہا تھا - وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ دیوی جو اسے نور نظر آتی ہے ظلمت و تاریکی کے تہ در تہ پردے ہیں - وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ دیوی جو بظاہر معصوم ہے حقیقتاً "قصاب خصلت" ہے اور اس کے اخلاق کا گلا کند چھری سے کاٹ رہی ہے -

یونیورسٹی کے امتحان میں چند دن باقی تھے

اور نیاز کی وہی بے ڈھنگی چال ــــ اگرچہ کورس کی وہ کتابیں جو اس دیوی کے چرنوں پر نچھاور کر چکا تھا۔ دوبارہ خرید رہا تھا ــــ مگر ان کو پڑھتا کیسے۔ اس کا خیال تو ہر وقت ادھر ہی رہتا۔ کتابیں صرف میز ہی کی زینت بن سکیں۔ امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ مگر اس کے پروگراموں میں کچھ تبدیلی نہ ہوئی۔

ہوسٹل کے کمرہ ۹ میں صرف دو لڑکے رہتے تھے۔ جب سابق سٹڈی ٹائم شروع ہو چکا تھا۔ مگر دو میں سے ایک بستر ابھی تک خالی تھا۔ نیاز شام سے پھر غائب تھا۔ اعجاز کمرہ میں اکیلا بیٹھا تھا کبھی تو وہ پڑھنے لگتا اور پھر اچانک کسی سوچ میں ڈوب جاتا۔ آج اس کے غصّہ اور صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ وہ ذرا سی آہٹ پر بھی دروازہ کی طرف دیکھنے لگتا۔

کلاک کی سوئیاں چلتی رہیں۔ اور وہ انہیں بار بار دیکھتا رہا۔ انتظار ہوتا رہا۔ گھڑی کی دونوں سوئیاں آپس میں مل گئیں۔ بارہ بجنے کا اعلان ہوا اور پھر پندرہ منٹ بعد ہی خالی بستر پر بیٹھا ایک لڑکا جرابیں اتار رہا تھا۔

"نیاز! تم کہاں سے آئے ہو اس وقت؟"
اعجاز نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ جرابیں اتارنے والے کا رنگ پہلے تو سفید ہو گیا۔ اور پھر اچانک سُرخ۔

"تمہیں اس سے کیا؟" اس نے ظاہری دلیری سے جواب دیا۔

"نیاز! تمہاری ترش کلامی پہلے کی طرح آج بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی مجھے میری باتوں کا جواب چاہیئے۔" اعجاز نے بہت نرمی سے کہا۔

"میرے پاس آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں" نیاز نے جواب دیا۔ اور اب اس کا تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ مگر اس کا دوست اعجاز اضطرابی کیفیت میں اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ اس کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اے کاش! نیاز اس آگ کے شعلوں کا مشاہدہ کرنے کا اہل ہوتا۔

اس سے بہتر وقت اور کونسا ہو سکتا تھا۔

اعجاز نے اپنے دوست کو اس بدبودار دلدل سے نکالنے کی آخری کوشش کرنا چاہی۔ اس کے منہ سے غیر معمولی بلند مگر رقت آمیز آواز نکل رہی تھی۔

"نیاز! اعجاز اب تھک گیا ہے اور اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ــــ ہوش کے ناخن لو نیاز! ــــ اب بھی وقت ہے ــــ تم سنبھل سکتے ہو ــــ۔۔۔ نیاز! اپنی جوانی پر رحم کرو ــــ اپنے والدین کی دعائیں لینے کے قابل بنو۔۔۔۔۔ میرے دوست اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا ہی کچھ خیال کرو ــــ اس معصوم پر ہی ترس کھاؤ جو ہمیشہ کے لئے تمہاری پٹی سے بندھ چکی ہے ــــ یہ اس پر ظلم ہے یہ اس سے خیانت ہے نیاز ــــ اب دوسرا سال بھی بیت چکا لیکن میدان تعلیم میں تم نے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا وقت عزیز کی قدر کرو۔۔۔۔۔ میں تمہیں تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔۔۔۔ نیاز تم کتنے معصوم تھے لیکن اب تمہاری زبان ہر لفظ کے ساتھ ایک گالی بھی اگل دیتی ہے

"اُف نیاز! اگر بیانِ حقیقت نہ ہوتا تو میں ہرگز یہ الفاظ تمہارے متعلق برداشت نہ کر سکتا۔۔۔۔۔ نیاز! بتاؤ بھی ایسا کیوں ہوا۔۔۔۔؟ آخر جواب تو دو میری بات کا!

"۔۔۔۔ کیا یہ سب اسی لعنت کا نتیجہ نہیں۔۔۔۔۔ نیاز یہ فلمیں ایک لعنت ہیں۔۔۔۔ تمہارے لئے اس بازار کی تجارت مناسب نہیں۔ تم سلامتی اور رحمت کے نام لیوا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم مسلم بھی رہو اور مسلم کے خلاف بھی رہو۔ یہ فلمیں مذہب کی زندگی بخش تعلیمات کی تغلیط ہیں۔ مذہبی احکامات کے خلاف ایک ناپاک سازش ہیں۔ یہ معاشرے کی چھاتی کا ایک کریہہ گھاؤ ہیں۔ یہ حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہیں — ایک خواب ہیں — ایک بے حقیقت اور جھوٹی تسلّی دلانے والا سراب۔۔۔۔۔۔ یہ انسانیت سے ایک حسین مذاق ہیں۔۔۔۔۔ نیاز۔ اس کا نشہ شراب سے بھی زیادہ تباہ کن اور جوئے سے بھی زیادہ خطرناک اور نقصان رساں ہے۔ نیاز! یہ ایک کیچڑ ہے — غلیظ کیچڑ — جسے پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرے ہوئے چند لوگ ایک سفید چادر میں لپیٹنا چاہتے ہیں۔ کاش! وہ اتنا بھی خیال نہیں کرتے کہ انسانیت کی اُجلی اُجلی چادر پر اس کیچڑ کے بدنما داغ دھبے کتنے برے معلوم ہوں گے۔

"آہ! کتنے معصوم دل اور کتنی معصوم روحیں اس لعنت کے عوض انضباطِ انسانیت کی اطاعت سے باغی ہوگئیں۔ میرے دوست! آج معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کی سب سے بڑی یہی گندی کیچڑ اور ناپاک فلمیں ہیں۔۔ رفیق عزیز! مجھے معلوم ہے کہ تم میری اس قسم کی باتوں کو غلط تصور کرتے ہو لیکن خدارا تعصّب کی چادر پرے پھینک کر ذرا انصاف کی نظر سے تو دیکھو۔ وہ ہستی جسے ہم اپنا آقا اور راہبر تسلیم کر چکے ہیں — جس کی بدولت ہم اندھیروں میں بھٹکنے کی بجائے روشن فضاؤں میں صراطِ مستقیم پاتے ہیں — وہ بابرکت ہستی جو ہماری اصلاح کے لئے غم میں مر مر کر جیتی ہے — جسے اپنا فکر نہیں ہمارا غم ہے۔ نیاز۔۔۔۔۔ مجھے جواب دو کیا تم اس جاں نثار آقا کی بھی حکم عدولی کر دگے — کیا اس کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں کی یوں ہتک کر دگے؟ نیاز! غور سے سنو۔ تمہارا آقا جس کے ہاتھ پر تم نے بیعت کی، فلم بینی کو فضول خرچی قرار دیتا ہے — وہ فلموں کو برائی کی جڑ قرار دیتے ہوئے ہمیں ان سے منع کرتا ہے۔

"برادرِ مکرّم! اے کاش تم پیارے امام کی حقیقت افروز باتوں پر کان دھرتے۔۔۔۔۔۔ کیا تم ایک سنہری گھڑی کے مالک نہ تھے؟ لیکن اب وہ کہاں گئی — تم اپنی ہیرے کی انگوٹھی پر ناز کیا کرتے تھے لیکن اب نہیں کر سکتے — تم نے اپنی ہر چیز کو بے دردی سے فضولیات کی قربانگاہ پر رکھ دیا۔ لیکن عزیز بھائی! تمہیں حاصل کیا ہوا؟ نفس کی چند لمحوں کی ایک جھوٹی لذّت۔ کیا تم یونہی کرتے چلے جاؤ گے۔ کیا اب بھی تم مجھے

(باقی دیکھیں صفحہ ۸۱ پر)

محشر
ایف۔ اے۔ سال اول

افسانہ

صدمے اٹھا کے!!!

آسمان سیاہ بادلوں سے گھرا ہوا تھا جن کی گرج چمک اس بھیانک اور ڈراؤنی تاریکی کو اور بھی دل ہلا دینے والی بنا رہی تھی۔ وہ آج بھی موسم کی اس شدت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے روزمرہ کی ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے مجازی خدا کی قبر کے سامنے کھڑی اپنے حقیقی خدا سے یہ دعا مانگ رہی تھی کہ "اے میرے رحیم خدا۔ تو مجھ پر رحم فرما۔ زمانہ نے مجھے کتنی چوٹیں لگائیں اور مجھے کتنے ہی صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور میرے تمام سہارے ایک ایک کر کے جاتے رہے۔ اب اے میرے مولا! میں تجھ ہی سے مدد چاہتی ہوں تو مجھے اپنے فضل سے تمام مشکلات اور تکالیف سے نجات عطا فرما۔"

اشکبار آنکھوں سے جب وہ یہ دُعا مانگ کر فارغ ہوئی تو بے اختیار اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے حالات ایک ایک کر کے فلم کی طرح آنے لگے۔ ایک وہ وقت تھا کہ جب وہ زمانہ کی مشکلات سے بے پرواہ والدین کی لاانتہا محبت کے سائے تلے اپنی بچپن کی زندگی گذار رہی تھی۔ محلہ کی چھوٹی چھوٹی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ اس کا آنکھ مچولی کھیلنا اور تمام دن خوشی سے ناچتے کودتے اور گاتے گزر جاتا۔ پھر وہ سکول داخل ہوئی۔ کیسا اچھا وہ وقت تھا ماں باپ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ اگر ذرہ بھر بھی تکلیف ہوتی تو والدین کس طرح بے چین ہو کر رہ جاتے تھے۔ لیکن ایک دن — آہ — وہ دن کیسا ہی منحوس تھا — جبکہ اس کی پیاری والدہ — اس سے ہر دم محبت کرنے والی والدہ — اور اس کی مشفق و ہمدرد ماں کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس سے چھین لیا تھا۔

شکیلہ کی مشفق اور مہربان ماں۔ جو اپنے خاوند سے بے انتہا محبت کرتی تھی کی وفات کے بعد اس کے ہمدرد والد بھی اپنی مرحوم اہلیہ کی یاد میں گھل گھل کر اندر ہی اندر ایسا روگ لگا چکے تھے کہ وہ چند ہی ماہ کے اندر سالوں کے بیمار نظر آنے لگے۔ اور آخر وہ بھی شکیلہ کو اکیلا چھوڑ کر اس دُنیا سے کوچ کر گئے معصوم دل پر یکے بعد دیگرے دو کاری چوٹیں لگ چکی تھیں۔ رشتہ داروں نے چند دن تک تو اس کی دلجوئی کی اور اسے اپنے گھر میں آنے کو کہا لیکن شکیلہ کسی کے گھر نہ گئی۔ آخر اس کی چند سہیلیوں نے جو اس کے پیہم صدمات کے باعث سکول نہ آنے کی وجہ سے بہت اداس اور بے چین تھیں وہ اپنی

ہیڈ مسٹریس کے پاس گئیں اور ان کو یہ تمام کہانی کہہ سنائی اس کی ہیڈ مسٹریس بھی ایک نہایت شفیق اور رحمدل عورت تھی اس کو بھی جوانی میں شادی کے کچھ عرصہ بعد خاوند کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔ اسکی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اور اس نے اپنی بہن کا ایک لڑکا بچپن سے ہی گود لے کر پالا تھا۔ ارشد اس کا نام تھا۔ ارشد اچھی شکل و صورت کا تو تھا ہی۔ لیکن اس پر اس کی تربیت کا ایسا رنگ چڑھا تھا کہ بڑے بوڑھے اس کی تعریف کرتے تھے شرافت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ہر ایک سے خوش اخلاقی اور پُرتپاکی سے ملتا اور ہر ایک کا دل موہ لیتا تھا۔

اس کی والدہ ہیڈ مسٹریس نے جب لڑکیوں کی زبانی شکیلہ کے متعلق سُنا تو اصرار کر کے اس کو اپنے گھر لے آئیں اور اس کو بیٹی بنا کر رکھا۔ یہاں آجانے سے پھر اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ شروع ہی سے تعلیم میں ہوشیار چلی آتی تھی اس لئے جلد ہی اس نے تعلیم مکمل کر لی۔ کچھ عرصہ بعد مشفق اور رحمدل استانی نے، جس کو شکیلہ اب اپنی ماں سمجھتی تھی۔ شکیلہ کی شادی ارشد سے کر دی۔ شکیلہ اور ارشد دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ شکیلہ اب اپنے تمام غم بھلا بیٹھی تھی۔ لیکن شادی کے چند ماہ بعد ہی اس کی یہ ماں بھی وفات پا گئی۔ استانی کی وفات سے اس کے دل کے تمام زخم ہرے ہو گئے اور اس کو اس کی وفات کا بہت ہی صدمہ ہوا۔ ارشد کو بھی اپنی خالہ کی وفات کا بہت صدمہ تھا لیکن وہ پھر بھی شکیلہ کا غم غلط کرنے کی کوشش میں رہتا۔ شکیلہ کے دل پر بچپن ہی سے کئی چوٹیں لگ چکی تھیں۔ پہلے اُسے والدہ کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا پھر والد بھی جلد ہی وفات پا گئے اور رشتہ داروں نے بھی اس کو گھر سے نکال دیا۔ اب اس کی یہ ماں بھی اس سے چھوٹ گئی۔ اس کی زندگی کے سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے گئے۔

دن گذرتے گئے اور غم کے بادل اس کے دل و دماغ پر سے چھٹنے لگے اور اس وقت جبکہ وہ دونوں ہنسی خوشی کی زندگی گذار رہے تھے اچانک اسے ایک بڑے صدمہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا مجازی خدا ارشد دفتر سے آتے ہوئے اچانک ایک کار سے ٹکرا کر سخت مجروح ہو گیا اور چند ہی دنوں میں ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

شکیلہ کے سامنے اب دنیا اندھیر ہو گئی۔ ہاں یہی مادی دُنیا جس میں اس کے تمام سہارے ٹوٹ گئے اور وہ اکیلی رہ گئی۔

اب اس کا صرف ایک ہی سہارا رہ گیا۔ ابدی ازلی سہارا۔ رحمان و رحیم خدا۔ نہاں در نہاں قدرتوں کا مالک خدا!!

عابد ربانی

نورِ نظر

پائیں باغ میں مختلف انواع کے طیور اپنی مختلف اقسام کی راگنیاں گا رہے تھے — کوئل آم کے درخت پر نغمہ زن تھی — آم کا کچا پھل سبز پتوں کے درمیان شاخوں کے جھنڈ میں اس طرح معلق تھا۔ جس طرح کہ سبز لباس والی نوخیز دلہن کے کانوں میں گوہر خضری سے مرصع بالیاں لٹک رہی ہوں — گلشن میں ہر طرف سرمست اشجار ہوا کی اٹھکیلیوں کا جواب جھوم جھوم کر دے رہے تھے — بلبل خلافِ معمول خاموش بیٹھی یوکلپٹس کے درخت سے نیم خندہ گلاب کے پھول کی طرف دیکھ رہی تھی —

سرمایہ دار اختر کی بیگم پائیں باغ میں بڑی دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی تھی — آم کے درخت تلے دو خوبصورت کرسیاں سبزے کے فرش پر سجی ہوئی تھیں ان میں سے ایک کرسی پر بیگم اختر براجمان تھی — اور دوسری غالباً رئیس اختر کے لئے خالی پڑی ہوئی تھی۔ بیگم اختر کی نگاہ کبھی کبھی آم کے درخت کی طرف اُٹھ جاتی۔ کیونکہ وہاں کوئل "کو۔کو" کے ترانے سُنا کر بیگم اختر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا رہی تھی — اب بھی بیگم ٹکٹکی لگائے مضطرب عندلیب پر اپنی نظروں کو مرتکز کئے ہوئے تھی —

یکایک کسی نے عقب سے بیگم اختر کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے — "کون ہے؟" بیگم کی خوفزدہ آواز نکلی — اور یہ کہتے وقت بیگم لرزہ براندام تھی — بیگم کے سوال کا جواب اب ایک طویل قہقہہ دے رہا تھا — اور قہقہہ کے ساتھ ہی بیگم کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹ گئے — اور وہ اپنے سامنے ہنستے ہوئے سرمایہ دار اختر کو دیکھ رہی تھی — "اچھا تو آپ تھے" وہ بولی — "ہاں میں ہی تو تھا نغمہ! مگر تم اتنی سہم کیوں گئی تھیں؟" اختر نے کہا — "میں کب آپ سے ڈرتی ہوں جناب" — "ابھی تو خوف کے مارے کانپ رہی تھیں" وہ بولا اور پھر نغمہ نے فلسفیانہ انداز میں اس ڈر کر کانپنے کی یہ وجہ بیان کی کہ جناب میں ایک عورت ہوں۔ اور قادرِ مطلق نے عورت کی فطرت میں یہ ودیعت کر رکھا ہے کہ وہ اچانک واقعات پذیری پر سہم جاتی ہے" — اپنی بیگم نغمہ سے یہ الفاظ سننے کے بعد اب اختر چپ ہو گیا اور خالی کرسی پر جا بیٹھا —

اختر آنکھیں بند کئے خاموش کرسی پر بیٹھا ہوا تھا — یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا — یکایک نغمہ کی آواز نے اسے چونکا دیا اور اُس نے آنکھیں کھول دیں — "اجی سُنئیے کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" کہنے لگا

"کچھ نہیں بس یونہی ایک خلش دل میں پیدا ہو رہی تھی" ـــ "دیکھیں نا ذرا وہ سامنے بلبل نہ جانے کتنی ہی دیر سے اس گلاب کے پھول کی طرف حیرانی اور اشتیاق سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہے" ـــ

نغمہ بولی۔ "اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" اختر نے استفسار کیا ـــ "یہی کہ اس کے سامنے اس کا نورِ نظر ہے۔ اور وہ اسے دیکھ کر اپنے قلبِ پریشاں کو مطمئن کر رہی ہے ـــ مگر آہ ہمارا کوئی نورِ نظر نہیں"۔

"نغمہ ـــ نغمہ! بس یہی خلش میرے دل میں پیدا ہو رہی تھی ـــ نغمہ تم نہیں جانتیں میں جب اپنے سرمایہ، مکانات اور جائیداد کو دیکھتا ہوں تو میرے دل میں کتنا درد پیدا ہوتا ہے ـــ میں سوچتا ہوں کیا یہ میری محنت کا ثمرہ، یہ میری املاک، یہ میرا اپنے خون سے سینچا ہوا گلشن، بس میری حیات سے ہی وابستہ ہے۔ کیا یہ میرے بعد ......"

اس آخری فقرہ کو ادا کرتے ہوئے اختر کی آواز بھرا گئی۔ وہ زیادہ ہمت کر کے بولا۔ "کیا یہ میرا لہلہاتا گلشن، میری آرزوؤں کا مسکن میری موت پر کسی اور کا ہو جائے گا ـــ کاش نغمہ کوئی ہم سے یہ سب کچھ لے لے اور ہمیں اولاد سا ثمرِ شیریں عطا فرما دے کاش ...... کاش ......"

اس پر یکایک نغمہ رو ہانسی مگر جوشیلی آواز میں بولی ـــ "نہیں کون یہ ثمرِ شیریں ہمیں دے سکتا ہے ـــ ایسا کوئی انسان نہیں ـــ ایسا کوئی بشر نہیں جو ہمیں اولاد دلوا سکے ـــ ہم نے کبھی سچے دل سے خداوندِ دو جہاں سے دعا نہیں مانگی۔ اٹھیں ہم چل کر آج خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر گڑگڑائیں اور اپنے گناہوں پر توبہ کی چادر ڈلوائیں ـــ کیونکہ قادرِ مطلق ہی ایسی ذات ہے ـــ جو کہ مناؤں کے کھنڈرات کو پھر اعلیٰ و ارفع محلوں میں تبدیل کر سکتی ہے ـــ اور آرزوؤں کی اُجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد شہر بنا دیتی ہے ـــ چلیں ہم خدا کی بارگاہ میں اپنی عجز و نیاز سے معمور دعا پیش کریں" ـــ

"کاشانۂ اختر" میں آج بڑی دیر سے کسی کی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے کی آواز آ رہی تھی ـــ نوکر دوڑے اور سہمے ہوئے اندر کی طرف بھاگے جا رہے تھے ـــ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ بیگم اور رئیس دونوں سجدہ ریز ہیں۔ اور گڑگڑا رہے ہیں ـــ تو وہ بھی وضو کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

آج اکثر لوگوں کے چہرے مسرت سے معمور تھے ـــ سارے شہر میں یہ مبارک خبر لوگوں کو ایک مژدہ سنا رہی تھی ـــ اور ہر کوئی خوش نظر آ رہا تھا۔ چونکہ آج شہر کے سب سے بڑے سرمایہ کار اختر کو خالقِ دو عالم نے شادی کے تیرہ برس بعد ایک فرزندِ ارجمند سے نوازا تھا ـــ لوگ جوق در جوق "کاشانۂ اختر" کی طرف رواں دواں تھے ـــ رئیس اختر ایک خوبصورت نشست پر بیٹھا سب لوگوں کی مبارکباد وصول

کا جواب دے رہا تھا — اور ساتھ ہی ساتھ خدا کی رحمت پر اظہار تشکر بھی کرتا جاتا تھا —

غرباء اور امراء سب کے لئے بڑے وسیع پیمانے پر دعوت کا انتظام کیا گیا — ہر کوئی نومولود کو دعاؤں سے نواز رہا تھا — جدھر نظر اٹھتی — سب لوگ مسکراتے ہوئے نظر آتے تھے —

آخر اختر نے اپنے وقت کے سب سے بزرگ ترین عالم دین کو کہا کہ وہ دعا فرمادیں — اور دوسرے سب لوگ بھی ان کے ہمراہ نومولود کی دینی اور دنیوی ترقیات کے لئے دعا کریں — دعا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

نومولود کا نام "سعید غزال" رکھا گیا — غزال اس لئے کہ جو بھی نغمہ کے پاس بچے کو دیکھنے گیا — اس کے منہ سے بے ساختہ یہی نکلا — کہ نغمہ دیکھو تو ننھے کی آنکھیں کتنی دلکش ہیں — کوئی کہتا کہ ماشاء اللہ بچہ تو بالکل آہو چشم ہے۔ کہیں یہ آواز بلند ہوتی کہ اس ننھے کی آنکھیں تو ایسی ہیں جس طرح مصورِ فطرت نے آنکھوں کا تمام حسن انہیں میں منتقل کر دیا ہے — غرضیکہ جس نے بھی نومولود کو دیکھا — اس نے اس کی آنکھیں دیکھکر بے حد تعریف کی — فی الحقیقت اس کی آنکھیں تھیں بھی ایسی ہی — یوں معلوم ہوتا جیسے کہ اس کی آنکھیں نرگس کا پھول تھیں — لیکن نرگس کی طرح یہ ساکن نہیں تھیں بلکہ متحرک اور جیتی جاگتی خالقِ فطرت کی بڑائی کا ثبوت دے رہی تھیں —

اب نغمہ اور اختر دونوں بہت مسرور تھے۔ ان کی آنکھوں کا نور ان کے دل کا سرور اب انہیں مل چکا تھا — پہلے تو وہ افسردہ مضطرب رہ کر اپنی زندگی گذار رہے تھے۔ مگر اب ان کے دن عیش و طرب کا مسکن تھے — پہلے ان کی جائیداد ان کا منہ چڑایا کرتی تھی — اور ان پر ہنسا کرتی تھی۔ کیونکہ ان کی جائداد زبانِ حال سے ان کو پکار پکار کر کہا کرتی تھی۔ کہ تم نے تو مجھے بڑی کاوش سے تعمیر کیا — اور مجھے بڑی کاوش سے حاصل کیا — مگر کیا پتہ کہ تمہاری حیات کے بعد ایسے بیگانے لوگوں کے ہاتھ لگوں جو تمہاری ہر یادگار کو نیست و نابود کر دیں — مگر اب نغمہ اور اختر دونوں مطمئن تھے کیونکہ ان کو امید تھی کہ ان کا نورِ نظر سعید غزال ان کی یادگار کو قائم رکھے گا۔

غزال کا بچپن ایک شاہانہ دور کی جگمگاہٹ لئے گذرا — ناز و نعمت امکانی حد تک میسر آیا۔ — جس طرف بھی وہ قدم اٹھاتا نوکر چاکر اسے بڑھ کر گلے سے لگا لیتے — اختر نے اسے ہر اقسام کی اشیاء لا کر دے دیں۔ تاکہ کہیں اس کا اکلوتا بیٹا کسی خواہش کے پورا نہ ہونے سے دل شکستہ نہ ہو جائے۔ کہیں غزال کے کمرے میں کھلونوں کے انبار لگے ہوتے — کہیں اکل و شرب کے سامانوں کی فراوانی سے اس کا کمرہ بھرا ہوا ہوتا — غرضیکہ

غزال ایک ایسے چمنِ حیات میں دن گزار رہا تھا جہاں کہ خزاں کبھی بھی اپنا تسلّط نہ جما سکی ہو — اور جہاں رنگا رنگ کی مسرتوں کے پھول سدا رونق افروز رہیں —

سکول کے ایام میں اسے کبھی کسی اُستاد نے جائز یا ناجائز بات پر سزا تو درکنار جھڑکی تک نہ دی — حالانکہ وہ اکثر ایام میں سکول کا کام نہیں کرتا تھا — نہ جانے اس میں کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہوئے تھے — جو دوسرے لڑکوں میں نہیں تھے — اس کے ہم جماعتوں کو جب کبھی ناجائز طور پر بھی سزا ملتی تو وہ مسکرا رہا ہوتا تھا —

اس کے ہم جماعت اکثر آپس میں ایسی ہی باتیں کرتے کہ سنو یار! غزال کیا عرش سے اُترا ہے جو اسے کوئی بھی کچھ نہیں کہتا — نہیں یار عرش سے تو نہیں اترا بلکہ ہم نے اور اساتذہ نے اس کی آنکھوں کی تعریف کر کر کے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ان کی جماعت کا مانیٹر سب سے درست بات کہتا کہ ہاں بھئی! ایک تو اسے اپنی آنکھوں پر اتنا غرور ہے جو کہ ناقابلِ بیان ہے دوسرے وہ ایک امیر باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اور تم سب جانتے ہو کہ فی زمانہ امیری اور دولت نے سماج کو خرید رکھا ہے — ایک غریب اپنے خون، اپنے دل بلکہ اپنی جان تک کو بھی قربان کر دیتا ہے — مگر دنیا کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی — ایک غریب کی تمناؤں کا خاک و خون میں لتھڑا ہوا جسم دنیا سے روٹی کی فریاد کرتا ہے۔ تو دُنیا اس کی حسرتوں کے پرخچے اڑا دیتی ہے۔ اور معاشرہ کی بدسلوکی اس کی آرزوؤں کی برہنہ لاش کو ٹھوکر لگاتی ہے اور حقارت سے منہ پھیر کے دوسری طرف مڑ جاتی ہے مگر ایک امیر اپنی دولت سے آجکل سب کچھ خرید سکتا ہے۔ وہ وقار خرید سکتا ہے — عزّت اور شہرت حاصل کر سکتا ہے — وہ اپنی دولت کا سہارا لے کر انسان سے انسانیت خرید سکتا ہے" — یہ سُنکر غزال کے ہم جماعت خاموش ہو جاتے اور گردشِ دوراں کی ستم ظریفی پر اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

غزال نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں پر پاس کر لیا — اور کالج میں داخل ہو گیا — کالج میں اب وہ اور بھی غرور اور گھمنڈ سے دن گزارنے لگا — کیونکہ نئے داخل ہونے والوں میں سے اکثر باہر کے سکولوں میں سے آئے ہوئے تھے — ان نوآمدہ لڑکوں میں سے جو بھی اسے دیکھتا وہ اپنے ساتھی سے یہ کہے بغیر نہ رہتا۔ "ارے یار دیکھو! اس لڑکے کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں"۔ غزال اب ایسی باتیں اور اپنی تعریفیں سُن سُنکر اور سب لڑکوں کی انگلیاں اٹھتی دیکھ کر اور بھی مچل جاتا۔ اور اپنی خوبصورتی پر اترانے لگتا — اس کے دوست بھی امراء کے بیٹے ہی تھے — جب کبھی کوئی غریب طالب علم اسے مخاطب کرتا تو وہ اسے یوں جھڑک دیتا جیسے کہ وہ اپنے

نوکروں سے مخاطب ہے۔

کالج میں کوئی غریب لڑکا اگر شلوار پہنکر آجاتا۔ تو غزال کی ہنسی اسے دیکھکر رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ بعض دفعہ وہ ہنستا کم تھا لیکن پھر شلوار والے کو دیکھکر اپنے دوستوں سے یہ کہتا "دوست دیکھو اسے شلوار کیسے لگی ہے جیسے کہ تکیئے کو غلاف چڑھایا ہوا ہوتا ہے" کبھی کہتا کہ یہ پاجامہ پہننے والے مجھے تیرھویں صدی کی مخلوق لگی ہے ــــ قصہ کوتاہ اسے غریبوں سے نفرت تھی ــــ وہ غریبوں کو سمجھتا تھا کہ انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ــــ درحقیقت یہ نفرت اور ادہام اس کی آنکھوں کی خوبصورتی اور دولت نے پیدا کردیئے تھے۔

شام کے دھندلکے رفتہ رفتہ فضا پر تسلط جما رہے تھے ــــ ہلکی ہلکی پھوار اور برم جھم کی وجہ سے خنکی بڑھتی جارہی تھی ــــ "سمیرا کلب" میں غزال اور اس کا قیمتی لباس میں ملبوس نیا دوست شجاع بڑی دیر سے سرگوشیاں کررہے تھے ــــ اردگرد کے لوگ بار بار ان کی طرف دیکھ رہے تھے تقریباً چار گھنٹے شجاع کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد غزال نے کہا کہ اچھا یار اب چلتے ہیں ــــ تم صبح ضرور ــــ ہاں یاد سے ــــ میرا کام کرکے آنا ــــ شجاع نے کہا ــــ "میں تو تمہارا کام بہرصورت کرونگا ــــ لیکن تم بھی چار ..... ضرور"

"ہاں ہاں صبح میں تمہارے ہاتھ میں لاکر نوٹوں کی گڈی رکھ دوں گا ..... اچھا"

رات کے گیارہ بج چکے تھے ــــ غزال کار سے نکلا اور سیدھا باپ کے کمرے کی طرف گیا۔ "ابا جان"! خاموش فضا میں آواز گونجی اور دوسرے ہی لمحے رئیس اختر اپنے بیٹے کے سامنے کھڑا تھا۔ یکایک غزال بولا "ابا جان! مجھے اس وقت چار ہزار روپیہ کی ضرورت ہے ــــ آپ جلدی دے دیں" ــــ "بیٹا اس وقت ..... اس وقت تو میرے پاس دو ہزار ہیں صرف ــــ باقی کل دوپہر کو تک کھلے گا تو نکلوا لینا" ــــ اختر بولا ــــ لیکن ابا جان مجھے سخت ضرورت ہے اس لئے آپ ضرور دے دیں" ــــ "نہیں بیٹے میرے پاس دو ہزار کے علاوہ اس وقت کچھ بھی نہیں" پھر اختر نے دو ہزار روپیہ لاکر غزال کو دے دیا ــــ غزال کا چہرہ افسردہ سا تھا تاہم اس نے دو ہزار روپیہ لے لیا ــــ اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا ــــ اپنے کمرے میں جاکر اس نے اپنا جیب خرچ کا اس ماہ کا ہزار روپیہ نکالا اور تین ہزار کے نوٹ اکٹھے رکھ کر گننے لگا ــــ

جب اس نے نوٹ گن لئے تو پھر انہیں اپنی الماری میں رکھکر آگیا اور اپنے بستر میں لیٹ کر اس نے لحاف اوپر لیا اور بڑی دیر ادھر ادھر کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نیند آئی ــــ نیند آنے کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے اسے اور بھی تھپکیاں دیں اور وہ صبح بڑی دیر سے اٹھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے کار نکالی ——
اور سیدھا "سمیرا کلب" کی طرف چل دیا۔ وہ کار
چلاتا ہُوا بار بار اپنی جیب کی طرف دیکھ رہا تھا
—— اس کی جیب میں پڑے ہوئے تین ہزار کے
نوٹ جیب میں کافی نمایاں تھے —— وہ کلب کے
دروازے پر اُترا اور کار کو "پارک" کرکے تیسری
منزل پر چڑھ گیا —— وہاں شجاع بیٹھا اس کا
انتظار کر رہا تھا —— غزال، شجاع کے پاس جا
بیٹھا —— اور کہنے لگا "میرا کام کیا ہے؟" "اور
تم نے ——" شجاع بولا۔ غزال نے جوابی کارروائی
کے طور پر تین ہزار روپیہ شجاع کے سامنے رکھدیا
—— "غزال" شجاع بولا —— "فرمائیے!" اس نے
جواب دیا —— وہ رقاصہ تو کل آئے گی —— مگر
میں یہ نوٹ محفوظ کر لیتا ہوں —— اتنی دیر تم پیو
اور دل بہلاؤ" —— یہ کہتے ہوئے شجاع نے وسکی
کی بوتل غزال کی طرف بڑھادی —— اور غزال
غٹ غٹ کرکے اسے چڑھا گیا ——

خالی بوتل غزال نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی
تھی —— عین اس وقت ہوٹل سے نیچے شور بلند ہوا
—— سڑک پر ایک اندھا دوڑا جا رہا تھا —— اور
لوگ پکڑو۔ پکڑو کا شور مچا رہے تھے ——
یہ آوازیں سنتے ہی غزال بیرونی کھڑکی کے پاس
دوڑا ہوا آیا۔ اور نیچے دیکھنے لگا —— اندھا
اب بالکل اس کے نیچے سڑک پر تھا —— غزال
نے تڑاخ سے خالی بوتل اندھے کے سر پہ دے ماری
بوتل اندھے کے سر پہ لگی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سڑک
پر منتشر ہو گئی —— لیکن اندھا زخمی ہونے کے باوجود
آگے بھاگتا جا رہا تھا۔ غزال جوش میں بے خبر
ہو کر کھڑکی پر چڑھ گیا۔ نشہ اثر کر چکا تھا ——
ناگہاں وہ دھڑام سے سڑک پر گرا —— بوتل کے
نکیلے ٹکڑے اس کی دونوں آنکھوں میں پیوست
ہو گئے —— اور وہ اِدھر اُدھر نزع کی حالت میں ہاتھ
مار رہا تھا —— شاید وہ اپنا نورِ نظر یا اپنی خوبصورت
آنکھیں ڈھونڈ رہا تھا —— اسکی وہ آنکھیں جن کے
گھمنڈ نے اسے حقارت کی تہذیب سکھائی تھی اب
خوفناک گڑھوں کی صورت اختیار کر گئی تھیں ——
سڑک پر ایک لاش ہاتھ پھیلائے پڑی تھی ۞

بقیہ "سچی دوستی"

ناکام کر دوگے۔ میرے دوست میری دوستی کی لاج رکھو
میرے دوست! کیا تم میرے دل کا درد اور دماغ کا
صدمہ دور نہیں کر سکتے؟"

اور پھر اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکلے ہوئے
آنسو سید کتاب پر گر کر جذب ہونے کی کوشش کرنے لگے
نیاز اس کے سامنے گردن نیچے کئے بیٹھا تھا۔ یوں معلوم
ہوتا تھا۔ گویا اعجاز کا چشمِ تیزاب "نیاز" کے قلبی زنگ
کو دھیرے دھیرے دھوتا جا رہا تھا۔

"نیاز" اعجاز پھر بولا۔ "اٹھو اور توبہ کرو۔
نیاز! میں آج تم سے پختہ عہد لینا چاہتا ہوں کہ تم آئندہ
کبھی فلم نہیں دیکھوگے" "مجھے منظور ہے اعجاز بھائی!"
نیاز کی آواز میں رقت پیدا ہو چکی تھی۔ دوسرے لمحہ حقیقی
دوست درحقیقت گلے مل رہے تھے۔ ایک خوشی تھی —— ایک اضطراب تھا —— ایک سکون تھا ۞

ایم ۔ جے ۔ حزیں
بی ۔ ایس سی ۔ مظفر آباد

افسانہ

سپنوں کی راکھ

اور اس رات میں نے خوب سوچا، ذہن کے گوشوں کو بیدار کر کے، چاروں اطراف سے بے نیاز ہو کر، جب میں نے اپنی بے روزگاری کا ہر پہلو سے تجزیہ کیا، تو مجھے صرف ایک ہی راستہ دکھائی دیا، اور پھر دوسرے ہی لمحہ میں نے ایک فیصلہ کر لیا اپنے شہر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کا فیصلہ! اس شہر میں رہنے سے بھلا حاصل بھی کیا۔ جہاں روزی کا کوئی وسیلہ نہ ہو اور بھوکوں مرنا پڑے۔ سوچا۔ کسی دوسرے شہر جا کر روزی کمانے کا کوئی ذریعہ تلاش کرونگا۔ ایم۔ اے ہوں۔ کہیں چھوٹی موٹی کلرکی ایسی پوسٹ بھی نہ ملے گی کیا؟ تعلیم یافتہ ہوں، محنت سے کام لینا پڑا تو کوئی حرج نہیں۔ بہرحال یہاں سے کوچ ضرور ہوگا۔

"مگر جاؤ گے کہاں؟" دل کے شکستہ کونے سے ایک آواز اُبھری۔ بات واقعی غور طلب تھی ایک لمحے کے لئے میں سٹپٹا گیا، مگر فوراً حل مل گیا۔ اکثر سنتا آیا تھا کہ جو بھی بیکاری، بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنا شہر چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ وہ کراچی کا ٹکٹ لیتے ہیں۔ سوچا اپنی منزل بھی کراچی ہی ہوگی۔ اور اسی کراچی کی رعنائیوں کو سمیٹتے سمیٹتے رات کی تاریکی سحر میں بدل گئی۔ صبح بیدار ہو کر سب سے پہلے میں نے کوٹ کی جیبوں میں باری باری ہاتھ ڈال کر ساری پونجی اپنے سامنے ڈھیر کر لی۔ اور پھر باقی جیبیں ٹٹولیں۔ ان جیبوں کو بھی دیکھا جن میں کبھی بھول کر بھی ایک پائی تک نہ رکھی تھی۔ اب ساری پونجی میرے سامنے تھی۔ گنا، دوبارہ گنا، سہ بارہ گنا۔ ایک روپیہ اور باسٹھ نئے پیسے تھے۔ "اُف"۔ میں چکرا سا گیا۔ یہ رقم تو کراچی پہنچنے کے لئے ناکافی ہوگی۔ اب کیا ہوگا؟ چلو، پھر بغیر ٹکٹ ہی سہی۔ جو ہوگا دیکھ لیا جائے گا۔ سوٹ کیس میں چند ایک کپڑے رکھ کر، غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر میں دو بجے کے قریب سٹیشن پر پہنچ گیا۔ گاڑی کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا، سوچا کچھ کھا پی لیا جائے۔ ہو سکتا ہے بعد میں شاید جیل کی ہوا سے پیٹ بھرنا پڑے ریلوے ٹک شاپ سے چائے اور بسکٹ سے تھوڑی سی شکم پری کی۔ اور پھر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ مسافر جوق در جوق آنے لگے۔ ہاتھوں میں سوٹ کیس لٹکائے۔ کندھوں پہ گٹھڑیاں اٹھائے کتنے ہی قلی کے منتظر تھے۔ اتنے میں گاڑی آ گئی۔ مسافروں کی بھاگم بھاگ شروع ہو چکی تھی لوگ اُترنے، چڑھنے میں مصروف تھے، میں نے

سوچا، پہلے ہی سے گاڑی میں چڑھ کر بیٹھ رہنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ بلکہ اس وقت چڑھا جائے جب گاڑی حرکت میں ہو۔ کیونکہ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ زوردار وِسل کے ساتھ گاڑی کو ایک دھچکا سا لگا۔ اور پھر آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ میں کچھ آگے بڑھ گیا۔ ایک، دو اور یہ لو تین ڈبے میرے سامنے سے گذر گئے۔ میں اپنی بزدلی پر جھنجلا اٹھا۔ اپنے آپ پر بہت غصہ آیا اتنے میں گاڑی کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ لپک کر بجلی کی سی تیزی سے جو ڈبہ سامنے آیا۔ سلاخوں سے پکڑ کر پائیدان پر لٹک گیا۔ یہ تو بالکل جدید قسم کا ڈبہ نظر آتا تھا۔ سٹیشنوں کے عقب سے اندر جھانک کر دیکھا۔ تو ویرانی صلواتیں سنا رہی تھی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے کواڑ کھولنا چاہا تو مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ ایک بار پھر سٹیشنوں کے عقب سے جھانک کر دیکھنے کو تھا کہ میری نگاہیں کھڑکی کے پاس ہی جم کر رہ گئیں۔ "فرسٹ کلاس"، چمکتی ہوئی تختی میرا مذاق اڑانے لگی۔ میرے حواس باختہ ہوگئے یک نہ شد دو شد۔ ایک بغیر ٹکٹ اور دوسرے فرسٹ کلاس میں سفر۔ گاڑی سٹیشن کی حدود سے باہر نکل آئی تھی، اور میں ابھی تک پائیدان پر لٹک رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ دروازہ کیونکر کھلے۔ اتنے میں بڑے زور کے ساتھ کسی نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔ میں فوراً اندر چلا گیا۔ اندر ایک معمّر بزرگ آدمی تھے۔ وہ اکیلے ہی تھے۔ میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے وہ گرج پڑے۔ "کون ہو تم؟ چلتی گاڑی سے کیوں لٹک رہے تھے؟" ان کا لہجہ کمال کا رعب دار تھا، آواز میں بھی بلا کی طاقت تھی۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور کنکھیوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کا لباس بہت قیمتی تھا۔ سفید پریشان سے بکھرے ہوئے بال تھے، چہرہ ان پھولوں کی مانند تھا جن میں رنگ تو ہو مگر خوشبو زائل ہو چکی ہو۔ یکبارگی انہوں نے مڑ کر قہقہہ لگایا۔ میں کانپ گیا۔ اتنی سنجیدگی کے بعد یہ قہقہہ، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہنے لگے "بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ۔" تھوڑی دیر مجھے سر سے پاؤں تک بغور دیکھنے کے بعد وہ چپ چاپ بڑے سکون کے ساتھ برتھ پر بچھے ہوئے بستر پر دراز ہوگئے۔ میں ان کی شخصیت سے کافی مرعوب ہوگیا تھا، میری حالت اس پرندے کی سی تھی۔ جس کی پرواز صیاد کے بے رحم ہاتھوں نے سلب کر دی ہو۔ ایک جاسوسی ناول نکالا اور پڑھنے لگا۔ چند صفحات ہی پڑھے ہوں گے کہ میں چونک اٹھا۔ وہ نہ جانے کب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ میں نے معافی چاہتے ہوئے پوچھا۔ "فرمائیے" کہنے لگے۔ "اچھے نوجوان۔ کہاں جاؤ گے؟" میں بوکھلا گیا۔ "جی .... میں .... آپ کا مطلب ..... میں کراچی جا رہا ہوں۔" میرا جواب تھا۔ انہوں نے شاید میری کمزوری کو پا لیا تھا۔ پوچھنے لگے۔ "کیا کرتے ہو کراچی میں؟" میں اس قسم کے سوال کیلئے

سوچا، پہلے ہی سے گاڑی میں چڑھ کر بیٹھ رہنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ بلکہ اس وقت چڑھا جائے جب گاڑی حرکت میں ہو۔ کیونکہ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ زوردار وِسل کے ساتھ گاڑی کو ایک دھچکا سا لگا۔ اور پھر آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ میں کچھ آگے بڑھ گیا۔ ایک، دو اور یہ لو تین ڈبے میرے سامنے سے گذر گئے۔ میں اپنی بزدلی پر جھنجلا اُٹھا۔ اپنے آپ پر بہت غصّہ آیا اتنے میں گاڑی کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ لپک کر بجلی کی سی تیزی سے جو ڈبہ سامنے آیا۔ سلاخوں سے پکڑ کر پائیدان پر لٹک گیا۔ یہ تو بالکل جدید قسم کا ڈبہ نظر آتا تھا۔ شیشوں کے عقب سے اندر جھانک کر دیکھا۔ تو ویرانی صلواتیں سنا رہی تھی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے کواڑ کھولنا چاہا تو مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ ایک بار پھر شیشوں کے عقب سے جھانک کر دیکھنے کو تھا کہ میری نگاہیں کھڑکی کے پاس ہی جم کر رہ گئیں۔ "فرسٹ کلاس" چمکتی ہوئی تختی میرا مذاق اڑانے لگی۔ میرے حواس باختہ ہوگئے [illegible] نہ شُد دو شُد۔ ایک بغیر ٹکٹ اور دوسرے فرسٹ کلاس میں سفر۔ گاڑی سٹیشن کی حدود سے باہر نکل آئی تھی، اور میں ابھی تک پائیدان پر لٹک رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ دروازہ کیونکر کھلے۔ اتنے میں بڑے زور کے ساتھ کسی نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔ میں فوراً اندر چلا گیا۔ اندر ایک معمّر

بزرگ آدمی تھے۔ وہ اکیلے ہی تھے۔ میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے وہ گرج پڑے۔ "کون ہو تم؟ چلتی گاڑی سے کیوں لٹک رہے تھے؟" ان کا لہجہ کمال کا رعب دار تھا، آواز میں بھی بلا کی طاقت تھی۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور کنکھیوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کا لباس بہت قیمتی تھا۔ سفید پریشان سے بکھرے ہوئے بال تھے، چہرہ ان پھولوں کی مانند تھا جن میں رنگ تو ہو مگر خوشبو زائل ہو چکی ہو۔ یکبارگی انہوں نے مڑ کر قہقہہ لگایا۔ میں کانپ گیا۔ اتنی سنجیدگی کے بعد یہ قہقہہ، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہنے لگے "بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ۔" تھوڑی دیر مجھے سر سے پاؤں تک بغور دیکھنے کے بعد وہ چپ چاپ بڑے سکون کے ساتھ برتھ پر بچھے ہوئے بستر پر دراز ہوگئے۔ میں ان کی شخصیت سے کافی مرعوب ہوگیا تھا، میری حالت اس پرندے کی سی تھی۔ جس کی پرواز صیاد کے بے رحم ہاتھوں نے سلب کر دی ہو ایک جاسوسی ناول نکالا اور پڑھنے لگا۔ چند صفحات ہی پڑھے ہوں گے کہ میں چونک اٹھا۔ وہ نہ جانے کب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ میں نے معافی چاہتے ہوئے پوچھا "فرمایئے" کہنے لگے۔ "اچھے نوجوان۔ کہاں جاؤ گے؟" میں بوکھلا گیا۔ "جی ..... میں ..... آپ کا مطلب ......

میں کراچی جا رہا ہوں۔" میرا جواب تھا۔ انہوں نے شاید میری کمزوری کو پا لیا تھا۔ پوچھنے لگے "کیا کرتے ہو گے کراچی میں؟" میرے [illegible] کے ساتھ [illegible]

قطعی تیار نہ تھا۔ سوچنے لگا کیا جواب دوں؟ ایک خیال آیا۔ ہو سکتا ہے جھوٹ بولنے پر بعد میں پچھتانا پڑے کیوں نہ سچ سچ اپنی حالت بیان کر دوں، کہتے ہیں کہ سچ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ایک تجربہ ہی سہی۔ اور پھر یہ فکر بھی تو دامنگیر تھی۔ کہ کہیں اگلے ہی اسٹیشن پر ایس۔ ٹی۔ ای نے آ دبوچا تو کیا بنے گا۔ اس لئے میں نے مناسب الفاظ میں اپنی حالتِ زار ان سے کہہ ڈالی۔ جب میں کہہ چکا تو وہ کچھ دیر خاموش رہے میرے چہرے پر نظریں گاڑے۔ پھر انہوں نے لمبی سی ہُوں کہی۔ اور کہنے لگے "اچھا تم فکر نہ کرو۔ تم آج کے نوجوان ہمت کم اور جذبات زیادہ رکھتے ہو کچھ سوچتے سمجھتے نہیں ہو۔ کیا ہوا جو تمہیں اپنے شہر میں نوکری نہیں مل رہی تھی۔ پردیس کی ٹھوکریں بہت بری ہوتی ہیں"۔ کچھ دیر رک کر کہنے لگے۔ کیا کہا تم نے؟ ایم۔ اے پاس ہو"۔ "جی" میرے منہ سے فوراً نکلا۔ ان کے چہرے پر ان چند لمحوں میں کتنے ہی رنگ اُبھر آئے تھے۔ وہ بغور میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ وفورِ جذبات سے ان کے ہونٹ کانپنے لگے۔ پھر آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ میں حیران، مبہوت سا بیٹھا انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے آنکھیں جھکا لیں۔ اور بولے "تو پھر اچھا ہے میرے ہمسفر۔ کلیم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اس کی ماں کی بیوقت موت نے اسے تنہا ہی زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اس دن سے آج تک میں کلیم کی بڑے پیار اور احتیاط سے پرورش کر رہا ہوں۔ اب سوچتا ہوں تمہاری شکل میرے کلیم سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ بالکل کلیم ہی معلوم ہوتے ہو۔ ویسے بھی مجھے ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے، مجھے امید ہے کہ تم میری اس پیشکش کو ضرور قبول کر لوگے۔ کلیم تمہیں پا کر بہت خوش ہوگا بہت ہی خوش"۔ یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ان کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر نیچے گرنے لگے۔ میں نے سوچا شاید بیوی کی یاد نے انہیں رونے پر مجبور کر دیا ہو۔ میں چپ ہو رہا۔ گاڑی آہستہ ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن آ گیا تھا۔ گاڑی رک گئی تو انہوں نے اپنے گال رومال سے صاف کئے۔ آنکھیں پونچھ ڈالیں اور بستر پر ٹھیک سے ہو کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں دروازہ کھلا، اور میری جان ہی نکل گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا۔ آنے والا ایس۔ ٹی۔ ای نہ تھا۔ بلکہ درمیانے سے کپڑوں میں ملبوس کوئی اور آدمی تھا نووارد نے آتے ہی انہیں مخاطب کیا"۔ خانصاحب! کسی چیز کی ضرورت تو نہیں"۔ وہ یوں گویا ہوئے۔ "نہیں تو۔ ہاں ذرا ادھر آؤ کرمو۔ ذرا مجھے بٹوا تو دینا"۔ کرمو نے پہلے میری طرف، اور پھر ان کی طرف دیکھا اور پھر بٹوا جیب سے نکال کر انہیں دے دیا۔ انہوں نے اسے کھولا۔ اور پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے، "سیکرٹری صاحب! یہ میرے پرانے وفادار نوکر کرمو ہیں۔ اور بچپن سے ہی میری خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ آپ ایسا کیجئے۔

کہ۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئے۔ سو سو کے تین نوٹ نکال کر انہوں نے مجھے دینے کے لئے میری طرف بڑھائے۔ "یہ لیجئے یہ رقم آپ کو بطور ایڈوانس دی جا رہی ہے" میری رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہلکا سا تکلف برتتے ہوئے میں نے نوٹ لے لئے۔ اور کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لئے۔ انہوں نے بٹوا کرتوں کے حوالے کر دیا میں نے دیکھا۔ کرتوں کا چہرہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند زرد پڑ گیا تھا۔ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ نوکر آقا سے زیادہ محتاط کیوں ہے؟ کرتوں کیوں خوفزدہ سا ہو کر ان روپوں کو دیکھ رہا ہے۔ جو ابھی ابھی مجھے دیئے گئے ہیں؟ ایسے کتنے ہی پریشان کن خیالات میرے ذہن میں ابھر آئے۔ میں انہی سوالات کے تانوں بانوں میں الجھا ہوا تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی چل پڑی۔ کرتوں میری طرف گھورتا ہوا نیچے اتر گیا۔ وہ اپنے ڈبے کو چلا گیا۔ خانصاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔ بڑا گدھا ہے یہ نوکر سیکرٹری صاحب۔ بعض اوقات بری حرکتیں کرتا ہے۔ آپ اس کے گھورنے کا برا نہ منائیں۔" اور پھر انہوں نے سر کے نیچے سے ٹفن نکالا۔ "سیکرٹری صاحب۔ آیئے روٹی تو کھا لیجئے۔" "نہیں حضور، آپ تناول فرمایئے میں شکم پر ہوں۔ آپ بسم اللہ کیجئے۔" وہ روٹی کھانے لگے۔ اور میں خوابوں کی دنیا میں جا بسا۔ سوچنے لگا۔ قدرت کے کام بھی نرالے ہیں۔ جس کو دینے پر آئے، اس پر دنیا کی نعمتوں کے در وا کر دیتی ہے۔ گھر سے کس تنگ دستی کے عالم میں نکلا تھا۔ اگر اچانک خانصاحب سے ملاقات نہ ہو جاتی۔ تو شاید بھوکوں مرنا پڑتا۔ خدا نے چاہا۔ تو اب سونے چاندی میں کھیلوں گا۔ کاریں مجھے لئے اڑتی پھریں گی۔ زندگی میں مسرت ہی مسرت ہو گی۔ اور۔۔۔۔۔

اور میں سوچ ہی رہا تھا، ابھی خوابوں کے محل بنا ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا خانصاحب روٹی کھا چکے تھے۔ ان کے ٹفن میں صرف ایک روٹی بچ گئی تھی انہوں نے ہاتھ منہ صاف کیا۔ اور بستر پر لڑھک گئے۔ ایک دو ثانیہ بعد اٹھے۔ اور مجھے کہنے لگے۔ "سیکرٹری صاحب! اب ذرا آرام کر لیجئے۔ اگلے اسٹیشن پر ذرا چل پھر لیجئے گا۔" اور کہہ کر وہ بے اختیار ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے ان کا برا حال ہو گیا۔ وہ مسلسل قہقہہ پر قہقہہ لگائے جا رہے تھے حتیٰ کہ تھک کر بستر پر دراز ہو گئے اور میٹھی نیند سو گئے۔ خانصاحب کس فطرت کے آدمی ہیں ابھی اگر سنجیدگی سے گفتگو کر رہے ہیں تو آنے والے لمحے میں مسلسل قہقہے لگا رہے ہیں۔ خدا جانے کیا راز ہے؟" میں سوچنے لگا۔ پھر ایک خیال دماغ میں آیا۔ مجھے ان کی سنجیدگی یا قہقہوں سے کیا کام۔ کام ہے تو صرف نوکری سے۔ اپنا الو سیدھا ہے تو کچھ فکر نہیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ بڑے اطمینان سے سو رہے تھے۔ گاڑی بے تحاشا بھاگی چلی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ جیسے یہ گاڑی مجھے ان نامعلوم منزلوں کی جانب لئے جا رہی ہے جہاں کی بزم نشاط کا حقدار صرف میں

سی ہوں۔ جہاں فکر و الم کے تاریک بادل نہ ہوں گے اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بہت کچھ سوچتے سوچتے مجھ پر نیند کی غنودگی سی چھانے لگی۔ اور میرا طائرِ خیال انجان سی وسعتوں میں پرواز کرنے لگا۔ کہ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ میں اٹھ بیٹھا۔ گاڑی سٹیشن پر رک گئی تھی دل میں آیا کہ ذرا چہل قدمی کر لوں۔ خانصاحب ابھی تک سو رہے تھے۔ میں نیچے اترا ہی تھا کہ کرموں مل گیا وہ مجھے گاڑی سے ذرا دور لے گیا۔ پھر کہنے لگا۔ "بابو جی۔ آپ بھی کتنے بھولے ہیں۔ آپ میرے مالک کی طبیعت کو ابھی تک نہیں پہچان سکے۔ خدا را انہیں تنہا چھوڑ دیجئے۔ ان کے آرام میں مخل ثابت نہ ہوں۔" میں حیران تھا۔ سوچا۔ گدھا ہے یہ نوکر۔ بہت بدتمیز ہے۔" میں نے ذرا سختی سے کہا "خاموش! بکواس بند کرو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خانصاحب نے مجھے ابھی ابھی تمہارے سامنے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کیا ہے۔ اگر میں چاہوں تو تمہیں نوکری سے الگ کر سکتا ہوں۔" میں حیران ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ پریشانی کی کوئی علامت نہ تھی۔ وہ مسکرانے لگا۔ "آپ واقعی بہت بھولے ہیں بابو جی۔" پھر وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ وقت کی تنگی کا احساس کرتے ہوئے وہ جلدی جلدی کہنے لگا "بابو جی۔ میرے صاحب بہت امیر آدمی ہیں۔ مگر ساتھ ہی بہت دکھی بھی۔ ان کا اکلوتا بیٹا کلیم عین اس دن ایک حادثے کا شکار ہو گیا جس دن اس کی شادی تھی۔ اس دن سے خانصاحب اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا دماغ بھی کروٹ بدلتا رہتا ہے۔ آنے والے لمحے میں وہ کیا کریں گے۔ یہ کسی کو علم نہیں۔ مجھے شاید اس لئے نہیں بھول پائے کہ میں بچپن سے ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ میرا اعتبار کیجئے بابو جی اور کسی دوسرے ڈبے میں چلے جائیے۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔"

کرموں خاموش ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے کرموں کی نیت پر شبہ ہونے لگا تھا میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہتا تھا۔ کہ خانصاحب کی کڑک دار آواز نے ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ چلا رہے تھے۔ "کرموں کے بچے! کیا کر رہے ہو وہاں؟ غصے سے ان کا چہرہ لال انگاروں کی مانند دہک رہا تھا۔ ان کے ہونٹ غصے سے کانپ رہے تھے۔ وہ پھر چیخ اٹھے "کون ہے یہ تمہارے ساتھ؟" کرموں ان کی طرف بڑھ گیا۔ میں بھی ساتھ چل دیا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ "جی میں ہوں۔" انہوں نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور کڑک کر کرموں سے پوچھا۔ "پوچھتا ہوں۔ کون ہے یہ؟" کرموں کو نہ جانے کیا سوجھا اور نہ سوچھا اس کے منہ سے نکل گیا۔ "خانصاحب! ایک غریب آدمی ہے۔" اور خانصاحب نے وہ بچی ہوئی ایک روٹی اٹھا کر میری طرف پھینک دی۔ اور بڑی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگے۔ زوردار وسل کے بعد گاڑی رینگنے لگی۔ کرموں اپنے ڈبے کی طرف بھاگا

۴۲ لیکن میں بت کی طرح بے حس و حرکت پلیٹ فارم پر کھڑا تھا اصلیت اب منہ پھاڑے میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ سنہرے مستقبل کے محل دھڑام سے زمین پر آ رہے تھے دور کوئی زندہ دل گا رہا تھا۔ خزاں میں بہاروں کے خواب دیکھنے والے۔ کبھی کسی غریب کی

اسلم بھیڈ - ایف - ایس سی
نان میڈیکل - فرسٹ ایر

نورِ ایمان

بستی سے چند گز دور ایک پرانی طرز کے مکان میں مٹی کا چراغ جل رہا ہے جس کی مدھم روشنی صبح کے دھندلکے میں قسمت کی بیچارگی کا شکوہ کر رہی ہے - ایک ادھیڑ عمر عورت چراغ کی روشنی میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہی ہے - جس کی پُرسوز آواز صبح کی خاموشی میں دُور دُور تک پہنچ رہی ہے ایک دوشیزہ قریب ہی کھڑی ہے ہاتھ میں مٹی کی ایک لٹیا ہے - عورت نے اسے مخاطب ہوتے ہوتے ہوئے کہا

"بچی ناجی! جلدی سے وضو کر کے نماز پڑھ لے - ورنہ تیرے پتا جی سیر سے واپس آ رہے ہیں"

ناجی وضو کرنے لگ جاتی ہے - اور نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے - تھوڑی دیر کے بعد دروازہ پر دستک ہوتی ہے ناجی جلدی سے نماز ختم کرتی ہے - اور ماں کو احتیاطاً بتا دیتی ہے کہ پتا جی باہر کھڑے ہیں - وہ جلدی سے قرآن مجید کو صندوق میں چھپا دیتی ہے - دروازہ کھلتا ہے اور ایک معمّر آدمی غصّہ سے بھرا ہوا داخل ہوتا ہے "یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے ناجی! ہوں!! تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو - ماں کے ساتھ تم بھی مذہب ترک کرنے کے در پے ہو - یاد رکھو - اس کا انجام بہت بُرا ہوگا"

ناجی پتا کے یہ کلمات سُنکر سہم جاتی ہے اور اندر کی طرف کھسک جاتی ہے -

یہ معمّر آدمی ناجی کا باپ تھا - مذہبًا ہندو - بجری کوٹنے کا کاروبار کرتا تھا - ناجی اور اس کی ماں "پریماں" نے تو اسلام قبول کر لیا تھا لیکن یہ ابھی تک اس کے سخت خلاف تھا - اس کا نام دیوندر سنگھ تھا -

ناجی نے ناشتہ کیا - اور بھیڑوں کو چراگاہ کی طرف لے کر روانہ ہو گئی - سورج پہاڑیوں کے اوپر سے سر نکالے کھڑا ہے - شبنم پودوں اور پھولوں کی پنکھڑیوں کو الوداع کہہ رہی ہے - کبھی کبھار کوئی جنگلی جانور چھلانگیں بھرتا پہاڑی سے ظاہر ہوتا ہے - طائرانِ چمن غزل خوانی میں مصروف ہیں -

—— ناجی ان نظاروں سے بے خبر سر جھکائے بھیڑوں کو ہانکے جا رہی ہے - اس کے بحرِ قلب میں باپ کے الفاظ "یاد رکھو اس کا انجام بہت بُرا ہوگا" بار بار تیرنے لگتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں ——

—— چراگاہ آ جاتی ہے ناجی بھیڑوں کو چھوڑ کر خود گھاس پر لیٹ جاتی ہے - اپنے ماضی کے حالات

کو یاد کرتی ہے۔ اس نے عمر کے پندرہ سال اسی چراگاہ اور ان مٹیالی رنگ کی پہاڑیوں میں بسر کئے ہیں لیکن کبھی ایسی کیفیت نہ تھی جیسی آج ——— دوپہر کو اس کا باپ کھانا لاتا ہے اور کھانا کھلانے کے بعد واپس چلا جاتا ہے۔ سورج آہستہ آہستہ ڈھل رہا ہے۔ بھیڑیں چرنے کے بعد چشمہ کی طرف پانی کی خاطر چل پڑتی ہیں۔ اور ناجی بھی اٹھکر ان کے پیچھے پیچھے ہولیتی ہے ظہر کا وقت ہو جاتا ہے ریوڑ چراگاہ میں واپس آجاتا ہے ناجی وضو کرتی ہے، نماز ادا کرنے کے بعد پہلا پارہ قرآن مجید لیکر تلاوت کرنے میں محو ہو جاتی ہے۔

راجہ بلونت سنگھ کا بیٹا راجکپور گھوڑے پر سیر کر رہا ہے۔ ناجی کی تلاوت کی آواز اس کے کان میں پڑتی ہے اور وہ خود بخود اس آواز کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ قریب آکر رک جاتا ہے۔ اور کچھ دیر کے بعد جا کر بالکل قریب پشت کی طرف کھڑا ہو جاتا ہے۔ ناجی آہٹ پاکر اٹھ بیٹھتی ہے اور ذرا ہٹ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔

راجکپور:۔ تم یہ کیا پڑھ رہی ہو؟

ناجی:۔ تم کون ہو پوچھنے والے؟ (لیکن پھر ہندوؤں کا خوف دل پر چھا جاتا ہے اور قدرے سہم جاتی ہے)

راجکپور:۔ لڑکی ہوش سے بات کر! مجھے بتاؤ۔ تم کون ہو اور کیا پڑھ رہی ہو۔ تمہاری آواز مجھے بہت دور سے کھینچ کر لائی ہے۔

ناجی:۔ جناب میں دیوندر سنگھ کی بیٹی ہوں اور سامنے والی بستی میں رہتی ہوں اور یہ ایک قاعدہ پڑھ رہی ہوں۔

راجکپور:۔ میں آپ سے اس قاعدہ کا سبق لیا کروں گا۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس کو یاد کر کے تیری طرح خوش الحانی سے پڑھا کروں۔ تیری آواز بہت دلکش ہے۔ اور اس سے بڑھکر دلسوز"

یہ کلمات سنکر ناجی کے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی پھیل گئی۔ کہنے لگی "نہیں مہاراج! یہ کلام ہی ایسا ہے کہ جو بھی اسے پڑھتا ہے اس کی آواز میں سوز اور دلکشی خود بخود آجاتی ہے"

راجکپور:۔ اچھا مجھے آج تھوڑا سا پڑھا دیں باقی کل سہی۔

اب راجکپور کا معمول ہو گیا کہ وہ ہر روز قاعدہ کا سبق لیتا۔ اور سارا دن وہاں بیٹھا رہتا اسے ابھی تک یہ معلوم نہ تھا کہ یہ مسلمانوں کا قرآن پاک ہے۔

ایک دن دونوں شام ڈھلے تک بیٹھے رہے بھیڑیں گھر جا چکی تھیں۔ لیکن ناجی راجکپور کو سبق دینے میں مشغول تھی۔ کہ اتنے میں دیوندر سنگھ آپہنچا۔ آتے ہی زور سے گرجا۔ ناجی! ناجی! تو یہ کیا کر رہی ہے۔ تمہارے پاس راجہ کا بیٹا۔ اور اس وقت؟ اور تلاوت قرآن؟ آہ تو نے میری عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی اس نے ناجی کو ایسا تھپڑ رسید کیا کہ

وہ چکرا گئی۔ اب راجکپور کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے بندوق کے دستہ سے "دیوندر سنگھ" کو ایسا پیٹا کہ وہ الٹے پاؤں گھر بھاگ گیا۔

راجکپور نے ناجی کو گھوڑے پر بٹھا کر اس کے گھر چھوڑا۔ اور اپنے گھر کی راہ لی۔ صبح اٹھتے ہی سپاہی نے آکر بتایا کہ دربار میں حاضری ضروری ہے راجکپور جلدی سے وہاں پہنچا تو سامنے ناجی اور اس کی ماں کو ہتھکڑیوں میں پایا۔ باپ کو سلام کیا اور کھڑا ہو گیا۔

بلونت سنگھ:۔ ارے لونڈے تو کل شام کے وقت اس لڑکی کے ساتھ کہاں بیٹھا تھا؟

راجکپور:۔ جہاں پناہ! جنوبی چشمہ پر۔

بلونت سنگھ:۔ کس لئے؟

راجکپور:۔ اس لڑکی کے پاس ایک ایسی کتاب ہے جس کے پڑھنے سے پتھر دل بھی موم ہو جاتا ہے۔ اور.....

بلونت سنگھ:۔ "بند کرو بکواس! کیا تجھے معلوم نہیں کہ وہ کتاب مسلمانوں کی ہے؟

راجکپور:۔ تو پھر کیا ہے۔ میں نے پڑھ کر دیکھی ہے۔ واقعی ایک پاک کتاب ہے۔

بلونت سنگھ:۔ "توبہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کروگے ورنہ....."

راجکپور:۔ "پتاجی! یہ ناممکن ہے"

بلونت سنگھ:۔ (سپاہیوں سے) "اس کو ہتھکڑی لگاؤ اور قید خانہ میں بند کر دو"

(لڑکی اور اس کی ماں سے): "تم نے میرے لڑکے کو گمراہ کیا ہے۔ اور اپنا پاک مذہب ترک کیا ہے اس لئے تم دونوں کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ اس سزا سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اسلام کو ترک کر کے دوبارہ ہندو مت اختیار کر لو۔

ناجی:۔ ہمیں اسلام کی خاطر مرنا توبہ کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

دونوں کو پھانسی کے تختہ کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ ناجی کی ماں بیہوش ہو جاتی ہے۔ لیکن ناجی کے چہرے پر مکمل سکون ہے۔ وہ کبھی جلاد کی طرف دیکھتی ہے۔ کبھی ماں کی طرف کبھی راجکپور کے قید خانہ کی طرف اور کبھی آسمان کی طرف۔

موت کی سزا اور نورِ ایمان کی حلاوت اور چند روزہ زندگی اور اس کی شیرینی کے درمیان انتخاب درپیش ہے۔ جلد ہی نورِ ایمان کی حلاوت ناجی کو موت کی آغوش میں لے جاتی ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

افسانہ

عطاء المجیب راشد
بی۔ اے (فائنل)

ان کی دوستی کچھ زیادہ پرانی نہ تھی۔ ابھی ایک سال پہلے جب حمید اپنے گاؤں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شہر میں آیا اور ہائی سکول میں داخل ہوا۔ تو اس کا کوئی بھی دوست نہ تھا۔ وہ شہر میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا۔ سکول سے واپسی کے بعد سارا وقت اپنے مکان میں ہی رہتا۔ محلہ کے لوگوں سے بھی بہت کم ملتا۔ لیکن سعید سے اس کی دوستی اس وجہ سے ہوگئی کہ وہ نہ صرف اس کا جماعت کا ساتھی تھا بلکہ وہ دونوں ایک ہی سیٹ پر بیٹھا کرتے تھے۔ ان کے اس رشتۂ اخوت پر اب دو سال گزر چکے تھے اور ان کی دوستی کی کشتی ناراضگی، اختلاف رائے اور تلخ کلامی کے ہچکولے کھانے کے بعد اب پرسکون راستہ پر تیزی سے رواں دواں تھی۔ جب بھی ان میں کوئی دوستانہ اختلاف پیدا ہوتا تو ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی کہ صلح کرنے میں وہ پہل کرے۔

گاؤں کے لوگوں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ مذہبی ہوتے ہیں۔ یہ وجہ ہوگی یا کوئی فطرتی نیکی۔ بہرحال حمید ایک نیک اور خدا ترس نوجوان تھا سعید کی آنکھوں کے سامنے بار بار وہ منظر گردش کرتا جبکہ ایک صبح حمید اپنے بڑے بھائی کے ساتھ سکول میں داخلہ لینے آیا۔ کلاس جاری تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے چند منٹ بات چیت کی۔ اور پھر روانہ ہوگیا۔ سعید اپنے بنچ پر اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ اور ماسٹر صاحب نے حمید کو اس کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نہ معلوم سعید نے وہ وقت کیسے گزارا۔ لیکن حمید کے لئے وہ گھنٹہ گزارنا بڑا مشکل تھا۔ عجیب عجیب خیالات کے ہجوم کی وجہ سے وہ اپنے سبق کی طرف بھی توجہ نہ دے سکا۔ وہ بار بار سوچتا کہ قمیص شلوار میں ملبوس یہ دیہاتی طالب علم نہ معلوم کس قسم کا ہوگا؟ پڑھائی میں کیسا ہوگا؟ اخلاق کا کیسا ہوگا؟ اس کی سادہ سی وضع قطع دیکھ کر کبھی اس کے متعلق معمولی رائے رکھتا۔ اور اس کی ہمنشینی سے نفرت کرتا۔ لیکن پھر خود بخود ہی اپنے خیالات کی تردید شروع کر دیتا۔

یہ کشمکش ابھی جاری ہی تھی کہ گھنٹی بجی اور ماسٹر صاحب کلاس سے باہر چلے گئے۔ ابھی سعید اس تبدیلی کا اچھی طرح احساس بھی نہ کر پایا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک اجنبی آواز آئی۔

"السلام علیکم"

سعید نے اپنے ہم نشین کے سلام کا جواب دیا اور ہاتھ ملایا۔ سعید کو اپنے اس نئے ساتھی کی جرأت اور بے تکلفی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ چند منٹ باہم بات چیت ہوئی۔ ہر ایک نے اپنا اپنا تعارف کروایا اور کلاس کا کام پھر جاری ہو گیا۔

سعید دوستوں کے انتخاب میں بڑا محتاط واقع ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بُرے دوست کی دوستی اس کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے۔ اور ایک اچھے دوست کی مدد سے وہ زندگی کی مشکلات پر قابو پا سکتا ہے سعید اور حمید کی روز کی نشست و برخاست کے نتیجہ میں واقفیت کا پیدا ہو جانا تو لازمی تھا۔ لیکن سعید نے چند ہی دنوں میں یہ محسوس کر لیا کہ حمید اس قابل ہے کہ اسے دوست بنایا جائے کئی روز کے مزید غور کے بعد آخر ایک روز اپنے دوست سے اس بات کا ذکر کر ہی دیا۔

پیارے دوست! آج سے آپ میرے کلاس کے ساتھی یا دوست نہیں بلکہ میرے بھائی ہوں گے میں نے یہ اہم فیصلہ اس بات کو معلوم کر کے کیا ہے کہ آپ اللہ کے فضل سے نیک، شریف اور مخلص ہیں۔ ہر شخص کو کشمکشِ حیات سے گذرنے کے لئے اور زندگی کے پُر خار راستہ کو عبور کرنے کے لئے ہمدرد دوست اور غمخوار ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور آپ کے اعلیٰ اوصاف کی وجہ سے میں آپ کا انتخاب کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ خدا کی خاطر ہماری یہ دوستی اور رشتۂ اخوت پروان چڑھے اور ہم زندگی کی دوڑ میں دوش بدوش حصہ لیتے رہیں"

حمید ایک نرم اور الفت و محبت کے جذبات سے پُر دل رکھتا تھا۔ اپنے ساتھی کے ان پُر خلوص الفاظ نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا۔ گوناگوں جذبات کی وجہ سے وہ کچھ دیر کچھ نہ کہہ سکا پھر سعید کو مخاطب کیا:۔

"میرے بھائی! میں آپ کا از حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے دوستی کے لئے مجھ عاجز کو پسند فرمایا جب سے میں گاؤں سے یہاں آیا ہوں ایک مخلص اور غمخوار دوست کی تلاش میں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے آپ جیسے محسن اور لائق دوست کی رفاقت کا موقعہ ملے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ میں اپنی طاقت کے مطابق ہر ممکن اخلاص کے ساتھ اس تعلق کی بقا اور ترقی میں آپ کے ساتھ شریک رہوں گا۔ آپ کی رفاقت میرے لئے باعثِ مسرت ہوگی"

حمید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔ دونوں نے نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر غیر اختیاری طور پر نظریں نیچی ہو گئیں۔ دونوں کی آنکھوں میں محبت و عقیدت کے آنسو تیر رہے تھے۔

دونوں دوست ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے گئے اور روز بروز ان کی دوستی بڑھتی گئی شروع شروع میں حمید ایک دوسرے محلہ میں رہا

کرتا تھا اور ان کی ملاقات سکول کے وقت میں ہی ہوتی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد حمید نے کسی وجہ سے مکان تبدیل کر لیا اور سعید کے محلہ میں ہی نیا مکان کرایہ پر لے لیا۔ اس تبدیلی سے ان کی دوستی کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ اب ان کا اکثر وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا۔ وہ اکٹھے سکول روانہ ہوتے — وہاں بھی ایک ساتھ اکٹھے بیٹھتے اور چھٹی کے بعد اکٹھے ہی گھر واپس آتے — اس قرب کی وجہ سے ہر ایک کو دوسرے کی عادات اور اخلاق کے مشاہدہ کا بہت موقع ملا۔ وہ جب بات کرتے تو بڑے ادب اور محبت سے کرتے۔ ہر ایک دوسرے کے آرام کا خیال رکھتا اور کوشش کرتا کہ میری وجہ سے میرے دوست کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ حمید چونکہ گاؤں سے شہر میں آکر بہرحال ایک مہمان کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اس لئے سعید ہمیشہ اس کے اس احساس کو کم کرنے کی کوشش کرتا۔ کئی مرتبہ اس کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دیتا اور اس طرح ان کے درمیان محبت کے تعلقات مضبوط ہوتے چلے گئے۔

میٹرک کا امتحان آپہنچا۔ دونوں دوستوں نے دل لگا کر محنت کی۔ اگرچہ حمید بھی پڑھائی میں کچھ کم لائق نہ تھا لیکن جب بھی اسے مدد کی ضرورت پڑتی تو سعید ہمیشہ اس کی مدد کرتا۔ بعض اوقات وہ دونوں اکٹھے ملکر رات کو دیر تک بیٹھے پڑھتے رہتے دونوں کے پرچے خدا کے فضل سے اچھے ہو گئے اور جب دو ڈھائی مہینہ کے بعد نتیجہ نکلا تو دونوں اعلیٰ نمبروں پر پاس ہوئے۔ حمید امتحان سے فارغ ہونے کے بعد گاؤں چلا گیا۔ اور اس تمام عرصہ میں ان کے درمیان محبت و عقیدت کے مثالی خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا۔ جب حمید گاؤں سے واپس شہر پہنچا تو سعید نے سٹیشن پر اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اب کالج میں داخلہ کا مرحلہ تھا۔ دونوں دوستوں نے کالج میں داخلہ لیا۔ اور اس طرح زندگی کے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔

سعید اور حمید کی دوستی کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔ کلاس کے ساتھی تو اس بات کو جانتے ہی تھے اب محلہ کے لوگوں کو بھی اس کا علم ہو گیا۔ ان کے اچھے اخلاق، نیک کردار اور مخلصانہ دوستی کی ہر جگہ تعریف ہوتی۔ سعید کے والدین نے بھی حمید کی دوستی کو پسند کیا۔ اب ان کی دوستی اس حد تک ہو گئی تھی کہ وہ دن کا اکثر وقت اکٹھے رہتے۔ کالج کے وقت کے علاوہ کھیل کے میدان میں بھی ایک ساتھ رہتے۔ اکثر اوقات ان کی دوستی کو بطور مثال پیش کیا جاتا۔ اور محلہ کے لوگ اپنے بچوں کو ان کی مثال دے کر صلح و صفائی سے رہنے کی نصیحت کرتے۔ ان کے اخلاق اور عادات میں تو مشابہت تھی ہی اب لوگوں نے ان کی وضع قطع اور شکل و صورت میں بھی یکسانیت تلاش کرنا شروع کر دی۔ ہر طرف ان کی تعریف ہوتی کالج کے اساتذہ بھی ان کی تعلیمی حالت سے بہت خوش تھے۔

جہاں گل ہوتے ہیں، وہاں خار بھی ہوتے ہیں۔

اگر ایک طرف لوگ ان کی دوستی سے خوش تھے تو ان کی کلاس کے بعض ساتھی اس پر حسد بھی کرتے تھے وہ ہر وقت موقعہ کی تلاش میں رہتے کہ کسی طرح ان کے درمیان دشمنی اور نفرت پیدا کی جا سکے مجید تو اس معاملہ میں بہت ہی آگے بڑھ گیا تھا۔ مجید سعید کا دوست تھا۔ اور سعید کی حمید سے دوستی کی وجہ سے وہ حمید کا بھی دوست بن گیا تھا لیکن نہ معلوم کس وجہ سے وہ سعید اور حمید کی دوستی کو پسند نہ کرتا تھا۔ ان کا باہم اٹھنا بیٹھنا اس کی آنکھ میں ہمیشہ کھٹکتا۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتا کہ کسی طرح ان کی دوستی کو ختم کیا جائے۔ جب کبھی اسے موقعہ ملتا تو وہ ان کے درمیان غلط فہمی اور نفرت پیدا کرنے سے نہ چوکتا۔ بسا اوقات اس کی یہ کوشش سنگین صورت اختیار کر جاتی۔ لیکن سعید فطرتاً نیک اور اسلام کے احکام پر چلنے والا تھا۔ جب اسے مجید کی باتوں سے حمید کی دوستی کے بارے میں کچھ شک یا غلط فہمی پیدا ہوتی۔ تو وہ اس پر یقین کر لینے کی بجائے فوراً حمید کے پاس جا کر اس کی تصدیق طلب کرتا اور جب کبھی بھی مجید کی باتوں کی تصدیق نہ ہوتی۔ تو وہ اس کی ان جھوٹی باتوں سے بیزاری کا اظہار کرتا اور آئندہ انہیں قبول کرنے سے احتراز کرتا۔ دوستوں کی اس تدبیر کا سعید پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ان کی بدظنی پیدا کرنے کی تمام تدابیر ناکام رہیں۔ اور ان کی دوستی میں پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔

آج ان کی دوستی پر چار سال گزر چکے تھے۔ سعید کو بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا کہ اب حمید کے رویہ میں کچھ تبدیلی آ رہی ہے۔ لیکن جب بھی ایسا خیال کرتا تو وہ اس کو غلط قرار دیتے ہوئے ذہن سے محو کر دیتا۔ لیکن جب اس قسم کے واقعات ہر دوسرے چوتھے پیش آنے لگے تو سعید کو اس تبدیلی کا شدید احساس ہونے لگا۔ آج کلاس میں جب سعید نے اپنے دلی دوست کی طرف دیکھا تو اس کے ہمیشہ ہنستے والے چہرہ پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ سعید چپکے سے ہو بیٹھا۔ جب اس نے حمید کو دوسرے ساتھیوں سے ہنستے کھیلتے باتیں کرتے دیکھا تو اس کا افسوس لازمی امر تھا۔ آخر اپنے دلی دوست پر دوسروں کو یہ فوقیت کیوں؟ سعید اس کو بازار میں بھی ملا تھا لیکن خلاف معمول اس نے نہ تو خوشی کا اظہار کیا۔ اور نہ زیادہ دیر تک بات کرنا گوارا کی۔ سعید اپنے طریق کے مطابق ان غیر معمولی واقعات کا سبب پوچھنے کے لئے حمید کے گھر روانہ ہوا۔ دروازہ پر تالا لگا ہوا تھا۔ پڑوسی نے بتایا کہ وہ تو چھٹیاں گذارنے کے لئے آج صبح کی گاڑی سے اپنے گاؤں روانہ ہو چکا ہے یہ سنکر سعید حیران پریشان رہ گیا۔ الٹے پاؤں اپنے گھر واپس چل پڑا۔ سوچنے لگا کہ کیا یہ وہی غمخوار اور محسن دوست حمید ہے جو ایک لمحہ بھی اس سے دور رہنا گوارا نہ کیا کرتا تھا!

اور جب کبھی اسے اپنے گاؤں جانا ہوتا تھا تو اسے ضرور ملکر جاتا تھا۔ اس کے ذہن میں وہ منظر گردش کرنے لگا جب موسم گرما کی طبعی تعطیلات کو جانے سے قبل فرطِ محبت اور جدائی کے غم کی وجہ سے حمید کے آنسو بہہ پڑے تھے۔ اس کا ذہن یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اس کا پیارا دوست اس قدر بدل چکا ہے کہ اب گاؤں جانے سے پہلے وہ اس سے ملنا بھی ضروری نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے دوست کے اس غیر دوستانہ فعل کی ممکن وجوہ تلاش کرنے لگا۔ لیکن پاؤں کی ٹھوکر سے وہ چونک پڑا۔ خیالات میں گم وہ ایک دیوار سے ٹکرانے لگا تھا۔ وہ اپنے گھر کے قریب آچکا تھا لیکن اس کا دوست اس سے بہت دور اب اپنے گاؤں پہنچ چکا تھا۔

سعید کا احساس درست تھا۔ حمید اب وہ پہلے جیسا حمید نہ رہا تھا۔ اس کے لباس اور وضع قطع میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ سادگی پسند حمید اب آہستہ آہستہ فیشن کا دلدادہ بنتا جارہا تھا۔ اس کی گفتگو میں اب وہ پہلے سی سنجیدگی اور خلوص نہ تھا۔ اول تو وہ سعید سے زیادہ ملنا پسند نہ کرتا تھا اور اگر ملتا تو کوئی خاص بات نہ کرتا۔ چند منٹ ٹھہرتا اور پھر اسے چھوڑ کر اپنے دوسرے دوستوں سے جا ملتا۔ سعید نے محسوس کیا کہ وہ اب خلوص کے بجائے ظاہری ٹیپ ٹاپ کو پسند کرنے لگا ہے یہی وجہ تھی کہ اس کی دوستی کے اس نئے حلقہ میں اس قسم کے طالب علم تھے۔ وہ اکثر وقت ان کے ساتھ خوش گپیوں میں گزارتا۔ کالج کے بعد بھی حمید سعید سے بہت کم ملتا۔ جب حمید کے حالات کی یہ پریشان کن تبدیلی سعید کے لئے ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئی تو آخر ایک دن اس نے حمید سے اس کا ذکر کر ڈالا۔ حمید اس کی باتوں کو سنتا رہا۔ لیکن کوئی ایسا جواب نہ دے سکا جو سعید کو مطمئن کر سکتا۔ وہ بارہا حمید سے پوچھتا کہ آخر اس سے وہ کونسا ایسا جرم سرزد ہو گیا ہے جس کی پاداش میں اس سے یہ بے رخی برتی جارہی ہے لیکن حمید کو اپنے دوست کے خلوص اور دوستانہ تعاون پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہ مل سکی۔ سعید اس دن کے بعد اس انتظار میں تھا کہ شاید حمید کے رویہ میں کوئی تبدیلی واقع ہو لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

کالج سے آنے کے بعد آج سعید نے کھانا بھی نہ کھایا۔ وہ اپنے دوست کے بارہ میں سخت پریشان تھا بار بار سوچتا کہ آخر اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟ اسے دوست کے رویہ میں تبدیلی کا شدت سے احساس اور افسوس تھا۔ جب وہ اپنے دوست کی عادات کا زیادہ غور سے مطالعہ کرتا تو بعض اوقات وہ بے قرار ہو جاتا۔ ایک مرتبہ تو اس کے دل میں آیا کہ وہ ایسے بے وفا دوست کی دوستی کو خیرباد کہہ دے۔ اب اس کے دل میں بھی نفرت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ اسے ماں کی آواز سنائی دی۔

"بیٹا سعید! کیا آج کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"امّی! آج میری طبیعت کچھ خراب ہے۔"

یہ کہکر سعید پھر خیالات میں گم ہو گیا۔ اس کے نفرت اور افسوس سے ملے ہوئے جذبات رفتہ رفتہ اس کے محبت کے جذبہ پر غلبہ حاصل کرتے جا رہے تھے اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ وہ حمید سے دوستی نہ رکھے گا۔ اور نہ اس سے کوئی بات چیت کرے گا اس خیال سے اس کے ذہن کو وقتی طور پر کچھ آرام حاصل ہو گیا۔ لیکن بعد میں اچانک اسے خیال آیا۔ کہ کسی شخص سے اس کی برائی کی بنا پر تعلقات منقطع کر لینا تو کوئی نیکی نہیں۔ اگر ایک دوست کسی برائی میں ملوث ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے نفرت کرنے کی بجائے اس کی وہ برائی دور کرنے کی کوشش کرے اس وقت کے لحاظ سے یہ خیال قبول کرنا اس کے لئے تقریباً ناممکن امر تھا۔ لیکن جب اس کے ضمیر کی آواز نے بار بار اس کو اس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کیا تو بالآخر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس کو یقین ہو چکا تھا کہ ڈوبتے شخص کو بچانا اس کا فرض ہے۔ اپنے مظلوم اور مصیبت زدہ دوست کی مدد اس پر لازم ہے اور انہی باتوں کے زیر اثر اس نے اپنے دل میں پختہ عزم کر لیا کہ اب وہ حمید کی دوستی کو چھوڑے گا نہیں۔ بلکہ ہر ممکن طریق سے اس کی اصلاح کرے گا۔ تا آنکہ اسے پھر پہلے جیسا حمید بنا دے۔

اس عزم کا کرنا تھا کہ سعید ایک خاص ارادہ سے اٹھا اور حمید کے گھر کی جانب چل دیا۔ حمید اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔ سعید کی آواز پر قدرے تامل سے اٹھا اور ہچکچاتے ہوئے باہر آیا۔ علیک سلیک کے بعد سعید بولا۔

"پیارے دوست! میں آج ایک خاص عزم اور ارادہ سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک عرصہ سے ہمارے درمیان محبت اور اخوت کے کس قدر پختہ مراسم تھے۔ لیکن آج ان کا کچھ اثر باقی نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ اس تبدیلی میں میری کسی کوتاہی کا بھی دخل ہو۔ لیکن اگر میں یہ عرض کروں کہ اس کی اصل وجہ آپ کے نئے دوستوں کی صحبت ہے تو برا نہ مانیں۔ میں نے ابتداء میں آپ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس دوستی کو قائم رکھنے کے لئے ہر ممکن تعاون کروں گا۔ اسی عہد کی وجہ سے آج میں آپ سے یہ درخواست کرنے حاضر ہوا ہوں کہ براہِ مہربانی آپ اپنے دوستوں کے انتخاب کے بارے میں نظرِ ثانی فرمالیں۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ میں برائی کا ساتھ ہرگز نہیں دے سکتا۔ اگر آپ ان بُرے رفیقوں کی دوستی ترک کر دیں تو مجھے آپ کی رفاقت جاری رکھنے پر فخر ہوگا۔ اور یہی میری آپ سے پرزور اپیل ہے۔"

سعید کافی دیر حمید سے گفتگو کرتا رہا۔ اسے پرانی محبت کا حوالہ دیا۔ بُری صحبت کے نقصان کا احساس دلایا۔ غرضکہ ہر ممکن طریق سے اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ لیکن حمید پر اس کی باتوں کا ذرا بھی

اثر نہ ہوا۔ سعید اپنے دوست کی ہدایت کے لئے زیر لب دعا کرتا ہوا اپنے گھر واپس آگیا۔

سعید کی بیماری پر ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ اس کی چارپائی کے ساتھ والی میز دوائیوں سے بھری پڑی تھی۔ دن میں دو بار ڈاکٹر آکر اس کا معائنہ کرتا۔ جب بخار ذرا ہلکا ہوا تو اسے ہوش آنا شروع ہوا۔ ڈاکٹر کا علاج جو بڑی باقاعدگی سے جاری رکھا گیا تھا۔ بالآخر کارگر ثابت ہوا۔ رفتہ رفتہ سعید صحت یاب ہونے لگا۔ لیکن ابھی اس قابل نہ تھا کہ بستر سے اُٹھ سکے۔ بخار نے اسے نحیف اور لاغر کر دیا تھا۔ وہ کالج سے چند دن غائب رہا۔ تو اس کے دوستوں کو بیماری کا علم ہو گیا۔ اسی دن تمام دوست مل کر اس کی عیادت کو آئے۔ بعد میں بھی فرداً فرداً آتے رہے اور اس کے پاس بیٹھ کر دل بہلاتے۔ اس کے سبھی دوست آئے لیکن حمید ـــ جو ایک وقت اس کا عزیز ترین دلی دوست تھا ـــ اس کے گھر نہ آیا۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرتا۔ لیکن اس نے نہ آنا تھا نہ آیا۔

سعید کے حساس دل پر اس بیوفائی کا صدمہ لازمی نتیجہ تھا۔ وہ بستر علالت پر لیٹے پہر دل حمید کے اس رویّہ پر افسوس کرتا رہتا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اب وہ چلنے پھرنے لگا تھا۔ لیکن دل کا یہ زخم مندمل ہونے میں نہ آتا تھا۔ جب بھی اسے اپنی حالت اور دوست کی بے رُخی کا خیال آتا تو اسے حمید کی سابقہ محبت بھی فریب معلوم ہوتی۔ وہ خیالات کے عجیب چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف حالات بار بار اسے اس بات پر اکساتے کہ وہ حمید کے ساتھ اپنی درد والم کی ساری داستان کہہ سنائے۔ اس کے ساتھ قطع تعلق کر کے اس کو اپنی قسمت پر چھوڑ دے لیکن دوسرے لمحے یہ خیال آتا کہ حمید برا سہی لیکن وہ کیوں برا بنتا ہے۔ اگر اس کے دوست نے اس سے بے وفائی کی ہے تو کم از کم وہ خود تو ایک اچھا اور وفادار دوست بن کر دکھائے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے حمید کے وہ احسانات ایک ایک کر کے گذرنے لگتے۔ جو اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کا سبب بنے تھے۔ قصور سعید کا تھا لیکن حمید نے اس کا اقرار کر کے دوست کی بجائے خود سزا قبول کر لی تھی۔ سعید کے پاس فیس ادا کرنے کے پیسے نہ تھے اور اس کا نام کٹ جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن حمید نے چپکے سے اس کی فیس ادا کر دی تھی۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے خدمت اور احسان کا قدر دان تو تھا ہی۔ سعید نے اپنے دل میں یہ عزم کر لیا کہ خواہ کچھ ہو وہ اپنے اس خیر خواہ اور محسن دوست کو جو اگرچہ آج بُرا بن چکا ہے ہرگز نہ چھوڑے گا۔ بلکہ ہر ممکن حد تک اس کے احسانات کا بدلہ ادا کرے گا۔ اور اپنے اس عہد کو آخر دم تک نبھانے کی کوشش کرے گا۔

کاروانِ حیات اپنی منزل کی جانب تیزی سے بڑھتا رہا۔ کئی قسم کے واقعات رونما ہوئے لیکن وقت کا تیز دھارا انہیں ماضی کے تاریک پردوں کے پیچھے مستور کرتا رہا۔ سعید نے حمید کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تاہم یہ ناکامی سعید کے عزم و استقلال میں ذرا بھی جنبش نہ پیدا کر سکی۔ ایک دن کالج کے نوٹس بورڈ پر اپنے نام کا ایک خط نظر پڑا۔ تحریر کچھ جانی پہچانی سی تھی کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا:-

"میرے دوست! میں یہ خط آپ کو اپنے گاؤں سے بستر علالت میں لیٹے لکھ رہا ہوں۔ آج مجھے احساس ہوا ہے کہ آپ جیسے مخلص رفیق کی کیا قدر ہے یہ میری حماقت تھی جو آپ کو چھوڑ کر دوسروں سے دوستی بنائی۔ میں اپنی اس حرکت پر بہت نادم ہوں اور قبل اس کے کہ اس دنیا سے رخصت ہوں آپ سے اس بے وفائی کی معافی چاہتا ہوں امید ہے کہ آپ معاف کر دیں گے۔ والسلام

آپ کا ایک احسان فراموش دوست حمید"

خط پڑھکر سعید حیران و ششدر رہ گیا۔ لرزتے ہاتھوں سے خط گر پڑا۔ یہ بات اس کے لئے ناقابل یقین تھی۔ کہ اس کا دوست حمید جو چند روز قبل بالکل تندرست تھا آج موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ خط اٹھا کر ایک مرتبہ پھر پڑھا لکھائی اس کے دوست کی ہی تھی۔ اسی لمحہ وہ سر جھکائے سٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ بیماری کی خبر سنکر اس کے دل کو شدید صدمہ پہنچا۔

پہلی ہی گاڑی کے ذریعہ وہ اس کے گاؤں پہنچا۔ حمید کی حالت پہلے سے بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ سانپ کا زہر سارے جسم میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اس کے بستر کے گرد ڈاکٹر اور رشتہ دار سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سعید کو دیکھکر حمید کے چہرہ پر رونق آگئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے نہ معلوم کس خیال سے اپنے ہاتھوں سے چہرہ کو چھپا لیا۔ سعید اس کے پاس بیٹھکر حال پوچھنے لگا۔ علاج کی ہر ممکن صورت زیر عمل لائی گئی تھی۔ لیکن شروع کی ذرا سی غفلت کی وجہ سے اب زہر تمام جسم میں پھیل چکا تھا۔ چہرہ کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ خون کے بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ جب ٹانکے میں زیادہ درد محسوس ہوتی تو حمید کی چیخ نکل جاتی۔ سعید بیتاب ہو کر کہتا۔

"پیارے دوست! صبر کرو۔ میں اب آگیا ہوں۔ مستقل طور پر تمہارے پاس رہونگا۔ اور اس وقت تک نہ جاؤنگا جبتک تم صحت یاب نہ ہو جاؤ۔"

حمید کی حالت نازک ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سعید کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا تھا ڈاکٹر مایوس ہو کر اٹھ بیٹھے تھے۔ لیکن سعید بدستور اس کے پاس بیٹھا اس کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل وفورِ غم سے ڈوبا جا رہا تھا۔ حمید کے لبوں میں حرکت دیکھکر وہ آگے جھکا حمید کچھ کہنا چاہتا

---

۴۲ تھا لیکن اب اسکی طاقت جواب دے چکی تھی۔ حمید نے ایک لمبا سانس لیا اور بس ــــ حمید اس دنیا سے چل بسا تھا۔ کمرے میں دھڑام کی آواز آئی۔ سعید کرسی سے نیچے گر پڑا تھا۔ حمید کا باپ اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھا لیکن ..... لیکن ..... سعید کا جسم بھی

انتصار احمد مہار
بارھویں کلاس

دولت

شاہد اپنے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا خیالات میں مگن تھا کہ نوکر نے آکر آواز دی۔

"حضور چائے تیار ہے۔"

"بہت اچھا! ذرا میرے ہینڈ بیگ کو کار میں رکھدو..... لاہور جانے کا ارادہ ہے۔"

"لاہور کس کے پاس حضور؟" نوکر نے پوچھا

"اپنے چچا کے پاس۔" نوکر چلا گیا۔

شاہد اٹھا۔ چائے پی اور کمرے سے باہر آیا۔

"دیکھو کرم دین! مجھے شاید دو تین دن لگ جائیں۔ میرے آنے تک گھر کی اچھی طرح نگہداشت کرنا۔ صفائی کا خاص خیال رکھنا۔ اچھا!" یہ کہتے ہوئے شاہد نے کار اسٹارٹ کی اور لاہور روانہ ہوگیا۔

شاہد کے والد صاحب ایک مشہور وکیل تھے کامیاب وکالت کی وجہ سے دولت ان کے گھر کی لونڈی بن چکی تھی۔ کئی لاکھ کی لاگت سے اس نے ایک عظیم الشان بنگلہ تعمیر کیا۔ شاہد کی پرورش بھی بڑے ناز و نعمت میں ہو رہی تھی۔ دنیا کی ہر آسائش اسے میسر تھی۔ جس چیز کی وہ خواہش کرے فوراً دستیاب۔ غربت کے لفظ سے بھی واقف نہ تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو وہ اس لفظ سے نفرت بھی کرتا تھا۔ لیکن ان آسائشوں اور راحتوں کے باوجود ایک چیز اس کے خیالات کو منتشر کر دیتی تھی۔ اس کا تصور ہی اس کے ننھے سے دماغ میں خیالات اور احساسات کا طوفان برپا کر جاتا۔ اس کی گول اور موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے پُرنم ہو جاتیں۔ یہ چیز ماں کی محبت سے محرومی کے باعث تھی۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ والدہ اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ گئیں۔

وکیل صاحب کو اپنے بچے سے بے انتہا محبت تھی اور اسی محبت کی وجہ سے انہوں نے دوسری شادی نہ کی۔ وہ ہر وقت شاہد کے خوبصورت چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کے خواہاں تھے۔

ایام گذرتے گئے۔ شاہد اب گیارھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک روز جبکہ وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ نوکر نے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" شاہد نے پوچھا۔

"جی! میں فضل دین!" نوکر نے جواب دیا۔

"کیا بات ہے؟" شاہد نے پوچھا!

"جی ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں اُن کو ڈرائنگ روم میں بٹھا آیا ہوں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں" نوکر نے کہا۔

"بہت اچھا! چلو میں آیا" شاہد نے جواب دیا۔

شاہد ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی متفکر چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"معاف کرنا بیٹا! میں آپ کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔ گو ناقابلِ بیان ہے لیکن بیان کرنا بھی ضروری ہے..... آپ کے والد صاحب کو ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ ہسپتال میں ہیں" عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔

"کیسا حادثہ؟ کہاں پیش آیا" شاہد نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

"اپنے دفتر سے عدالت کی جانب جا رہے تھے جلدی کی وجہ سے کار بہت تیز چلا رہے تھے شاید آنے والے مقدمے پر غور کر رہے تھے کہ کار درخت سے ٹکرا گئی۔ زخمی حالت میں انہیں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ جہاں حالت کچھ زیادہ نازک ہے" بوڑھے نے جواباً کہا۔

"کس ہسپتال میں ہیں؟" شاہد کا دل ڈوب کو آ رہا تھا۔

"سول ہسپتال میں۔ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو ہی لینے آیا ہوں" اجنبی نے کہا۔

شاہد تذبذب اور گھبراہٹ کے عالم میں کار میں سوار ہوا۔ اجنبی نے کار اسٹارٹ کر کے ہسپتال کا رُخ کیا۔

کار ہسپتال کے گیٹ پر کھڑی ہوئی۔ شاہد بھاگتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں کہ اس کا والد پڑا ہوا تھا اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اور سانس پھولا ہوا تھا۔

جب برآمدے میں پہنچا تو ایک کمپاؤنڈر نے آ کر کہا کہ آپ کے والد صاحب کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

شاہد کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا دُنیا اسے تاریک نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو آفات کے بحرِ بے کراں میں اس ملاح کی طرح پایا۔ جس کی ناؤ تباہ ہو چکی ہو۔ وہ ہسپتال کی ہر چیز سے خوف محسوس کر رہا تھا۔ برآمدے میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ گرم گرم آنسو اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے بہکر رخساروں کو تر کرنے لگے۔ وہ اسی کیفیت میں کھڑا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

شاہد نے پیچھے دیکھا۔ یہ اس کے چچا تھے۔ جو ایک بہت بڑے افسر تھے۔

"صبر کرو بیٹا شاہد! صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ خدا تعالیٰ کو یہی منظور تھا ہمیں اس کی رضا پر خوش رہنا چاہیئے۔ اپنے آپ کو اکیلا مت

سمجھو۔ مجھے اب اپنا باپ سمجھو۔ میرے گھر کو اپنا گھر تصور کرو۔" شاہد کے چچا کی آنکھیں آنسوؤں سے پُرنم ہوگئیں ۔

---OOO---

والد کی وفات کو ایک ماہ گذر چکا تھا وہ اپنی کوٹھی میں اکیلا ہی رہائش پذیر تھا۔ اس کی زندگی پیکرِ غم بن کر رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کی رنگینیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مسکراہٹیں اس کے ہونٹوں سے ناآشنا ہوگئی تھیں۔ تنہائی نے اس کے کرب و غم میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ چچا کے ہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس کے چچا ہر روز اس کے پاس آتے بعض دفعہ چچی بھی ساتھ آجاتیں۔ اگر شاہد کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے اور شاہد کی افسردہ طبیعت میں رنگینی کا عنصر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ چچا ہر روز اسے کہتے۔

"بیٹا شاہد! میں تو اپنے لڑکے نعیم اور تم میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ خواہ مخواہ یہاں تنہا رہتے ہو۔ ہمارے گھر چلو۔ تاکہ تمہاری زندگی کی مسکراہٹیں واپس آجائیں۔ تمہارا غم دور ہو جائے۔"

شاہد غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے چچا کے ہاں جانا چاہیئے۔ ایک تو چچا کا بار بار کہنا اور دوسرے وہ خود بھی تنہائی کی زندگی سے قدرے اکتا گیا تھا۔

شاہد کو چچا کے ہاں آئے ہوئے چار ماہ ہو چکے تھے۔ چچا اور چچی کا سلوک حد درجہ قابل تعریف تھا۔ چچا اور چچی اس کی ہر بات تسلیم کرتے تھے شاہد بھی اپنے اس نئے ماحول سے مانوس ہوگیا۔ وہ چچا کے ہاں رہ کر بہت خوش تھا اس کا غم کافی حد تک دور ہوگیا۔ چہرے کی رنگینی۔ رخساروں کی شگفتگی اور ہونٹوں کی مسکراہٹیں واپس لوٹ آئیں۔ قہقہے جو اس کے لبوں سے رخصت ہوگئے تھے۔ دوبارہ اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگے۔

جب چچا اور چچی نے شاہد کو ماحول میں دلچسپی لیتے دیکھا تو انہیں اپنے اصلی مدعا یعنی شاہد کی دولت کو اپنے قبضے میں کرنے کی فکر ہوئی۔

---OOO---

شام کا وقت تھا۔ شاہد ریڈیو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک نعیم بیٹھک میں آیا اور کہا۔

"بھائی جان! امی جان اور ابا جان بلا رہے ہیں۔"

شاہد چچی اور چچا کے پاس گیا۔ چچی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ شاہد کرسی پر بیٹھ گیا۔

چچا نے جمائی لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"بیٹا شاہد! تمہارے والد کی کافی جائیداد تھی۔ اس میں سے کچھ تو تمہارے نام لگ چکی ہے مگر کچھ ابھی باقی ہے اب اس جائیداد کو بھی قبضے میں کرنا ہے۔ یہ درخواست میں نے لکھی ہے اس پر دستخط کر دو۔ تاکہ مناسب کارروائی کی جا سکے۔"

شاہد نے بغیر پڑھے ہی درخواست پر دستخط

کر دیئے۔ یہ کوئی درخواست نہیں تھی۔ بلکہ یہ تو ایک تحریر تھی۔ جس میں لکھا کہ میں اپنی تمام جائیداد چچا کے نام منتقل کرتا ہوں۔

جونہی چچا نے تمام جائیداد اپنے نام منتقل کرالی تو ان کے رویہ میں بھی تبدیلی آنی شروع ہو گئی شاہد کی پہلی سی دیکھ بھال اور قدر نہ رہی۔ اب اس کی ہر بات کو سختی سے ٹال دیا جاتا خواہ وہ ٹھیک ہی کیوں نہ ہو۔ چچا اور چچی کے پیار، شفقت اور محبت کی جگہ اب سرد مہری، بے مروتی اور بے التفاتی نے لے لی۔ شاہد کو بھی اس امر کا احساس ہو گیا اس کے خیالات پھر پریشانیوں کا شکار ہو گئے! افسردگی نے پھر اس کے گلاب جیسے چہرے کو اپنا مسکن بنا لیا وہ اس اچانک رویے کی تبدیلی پر بڑا حیران تھا۔

وہ اپنے ماضی اور حال پر نظر دوڑاتا تو اپنے آپ کو ایک ایسے پھول کی مانند پاتا جس کے چاروں طرف کانٹے ہی کانٹے ہوں۔ چچا اور چچی کے رویے کی تبدیلی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چچی تو ہر وقت اسے کوستی رہتی۔ اور ایک دن تو یہاں تک کہہ دیا۔

"تم جیسے کاہل اور سست لونڈوں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔"

"بہت بہتر چچی جان! میں اپنے گھر چلا جاتا ہوں آپ اپنے حال میں خوش رہیئے۔ میرے والد کی جائداد میرے لئے کافی ہے۔" شاہد نے ہمت سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

یہ سُنکر چچی غصے میں بولی۔ چالاک مت بنو۔ تمہارے والد کی کوئی جائداد نہ تھی جو تھوڑی سی تھی اس سے تم دستبردار ہو چکے ہو۔ اس تحریر پر اس دن تم نے دستخط کر دیئے تھے۔"

یہ بات سُن کر شاہد کے دل پر ایک چرکا سا لگا۔ اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ لیکن اس نے سوچا کہ کچھ بھی ہو۔ وہ وہاں نہیں رہے گا۔

وہ وہاں سے اُٹھا اور چچی کو سلام کر کے چل دیا۔ جب وہ باغیچے سے گذر رہا تھا تو باغیچے کی ہر چیز اس کا تمسخر اُڑا رہی تھی۔ بڑ کا بوڑھا درخت اس کا مُنہ چڑا رہا تھا۔ گلاب کے پھول اس پر طنز کر رہے تھے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی اس پر ہنس رہے تھے۔ لیکن وہ خاموش چلا جا رہا تھا۔ ایک انجانی منزل کی طرف!

---OOO---

شاہد اپنے دوست شکیل کے پاس گیا۔ شکیل کو وہ اپنا بہترین دوست تصوّر کرتا تھا۔ لیکن جب شکیل نے اسے اس کسمپرسی کے عالم میں دیکھا تو آنکھیں پھیر لیں۔ شکیل انتہائی سرد مہری سے پیش آیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر شاہد نے تہیہ کر لیا۔ کہ وہ طفیلیوں کی زندگی بسر نہیں کرے گا۔ چنانچہ وہ ایک ہوٹل میں ملازم ہو گیا۔ وہاں سے کچھ روپے اسے مل جاتے جس سے اس کا گزارہ ہونے لگا۔ یہ روپے اس کے لئے راحت کا موجب تھے۔ ایک دن وہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے پی۔ اے۔ ایف میں بھرتی کا اعلان پڑھا۔ اس نے بھی درخواست دیدی۔ اور بالآخر

اپنی صلاحیتوں کے باعث چن لیا گیا۔

بی۔ڈی پائلٹ کی ٹریننگ کے دوران وحید اس کا بہترین دوست بن گیا تھا۔ وہ اس پر جان تک قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔ ٹریننگ کے دوران اسے چچا اور چچی کی یاد آتی۔ ان کے لئے ہمدردی کے جذبات اس کے دل میں موجزن تھے۔ کیونکہ اس کا دنیا میں ان کے سوا کوئی نہ تھا۔

ٹریننگ ختم ہونے کے بعد شاہد ایک پائلٹ افسر بن چکا تھا۔ اس کو اپنا منگلہ مل گیا۔ نئے ماڈل کی کار اس نے خرید لی۔ وہ زندگی کے اس نئے دور کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی ماضی کی تلخ یادیں اس کے لطف میں مداخلت کرتیں۔ تو اس کی جان سراپا درد بن جاتی۔

—○○○—

فلائنگ افسر شاہد اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کہ نوکر نے ایک خط لا کر دیا۔ یہ خط اس کے چچا کا تھا جس میں لکھا تھا:۔

پیارے شاہد! تسلیمات!!

جب سے تم ہمیں چھوڑ کر گئے ہو۔ گھر میں اداسی چھائی رہتی ہے۔ دل ہر وقت پریشان رہتا ہے تمہاری چچی بھی اکثر پریشان رہتی ہیں۔ تمہاری جدائی کے غم کی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئی ہیں۔ ننھا نعیم بھی ہمیشہ تمہاری یاد میں مگن رہتا ہے۔

یہاں سے چلے جانے کے بعد ہر چند تمہیں تلاش کیا۔ لیکن بے سود۔ آخر کار ایک دن تمہارے دوست وحید نے جو مجھے ٹرین میں ملا تھا تمہارے متعلق بتایا۔ آج میں خط لکھ رہا ہوں۔ خدا کے لئے جلدی آ کر مل جاؤ۔ تاکہ میرے دل کو تسکین ہو۔ اور پریشانی دور ہو۔ چچی تمہیں محبت بھرا اسلام کہتی ہیں۔

منتظر جواب خیریت

آپ کا چچا۔

شاہد خط کو پڑھتے ہی خیالات کی وادی میں کھو گیا۔ اس کے خیالات کتاب ماضی کی حسین داستان کی ورق گردانی میں مشغول ہو گئے۔ جبکہ وہ ایک امیر والد کا لڑکا تھا۔ پھر اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"دولت! تو کیسی حسین اور دلکش چیز ہے۔ تیرے کملے (بیوقوف) بھی سیانے (عقلمند) ہیں بے شک تیرا وجود ایک سحر ہے، ایک جادو ہے۔ پر خوش قسمت ہیں وہ جو چیلوں اور کوؤں کی طرح تجھ پر نہیں گرتے۔ بلکہ تجھے بھی اپنے خالق کی رضا جوئی کا ایک ذریعہ بناتے ہیں۔ بدبخت ہیں وہ جو تجھے "مردار" کی حیثیت دیتے ہیں اور خوش قسمت ہیں وہ جو تجھے "بادِ کردار" سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔"

"یہ کالج تعلیم الاحمدیہ کالج نہیں تعلیم الاسلام کالج ہے اور اسلام ایک وسیع لفظ ہے کوئی کوڈ آف مارلیٹی جس کو علمائے اسلام نے کسی وقت تسلیم کیا ہو۔ یا اب اسے تسلیم کریں وہ اسلام میں شامل ہے پس میں طلبہ کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ تم کالج کی روایات کو قائم رکھو یہ تعلیم الاسلام کالج ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ کالج تمہیں عملی مسلمان بنا دے گا اور یہی اس کالج کے قائم کرنے کی غرض ہے۔" (الامام)

رشید جاوید

افسانہ

تاثیرِ عمل

(کردار، جگہوں کے نام اور واقعات فرضی!!)

جہاز سمندر کی موجوں سے کھیلتا ہوا تیزی سے منزلِ مقصود کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دارالاحمد سے کرائسٹ لینڈ (Christ Land) اڑھائی دن کی مسافت پر واقع تھا۔ تیسرے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ "المبشر" کا پہلا سٹاپ سیسل برگ (Cecil Burgh) کی بندرگاہ پر ہونا تھا۔ عابد خیالات کی دنیا میں گم نہ معلوم کیا منصوبے سوچ رہا تھا۔ آج کا سفر اس کی زندگی کا تلخ ترین سفر بھی تھا اور شیریں ترین بھی۔ کرائسٹ لینڈ دس کروڑ کٹر عیسائیوں کا ملک تھا۔ ایک ایسا ملک جس کے بسنے والے بانیٔ اسلام کا نام سننا بھی برداشت نہ کر سکتے تھے جن کا اٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا بچھونا اور مرنا جینا صرف اور صرف اسلام کی مخالفت کے لئے وقف تھا۔ جہاں سے "واٹس آف لائن" کے ذریعہ روزانہ گھنٹوں فضاء آسمان کی لہروں میں سمِ کینہ کے جراثیم چھوڑ کر کروڑ ہا مسلمانوں کے دل دکھائے جاتے تھے ۔۔۔ تھوڑے وقفہ بعد عابد اس ملک کی سرزمین پر اترنے والا تھا جس کے چپہ چپہ پر اسلام اور اس کے مقدس بانیؐ سے تمسخر و استہزاء کیا گیا ۔۔۔ جہاں دجالی مخالفت کا آتش فشاں مسلسل چوبیس گھنٹے "لاوا اگلتا رہتا تھا" کیا تو اپنے آقا اور مطاع کی مخالفت برداشت کر سکے گا؟" یہ تلخ سوال باربار عابد کے ذہن کو جھنجوڑ رہا تھا ۔۔۔ "اگر میں اپنے آقا کی مخالفت برداشت نہ کروں گا۔ تو ان دس کروڑ ضالّین کو تاجدارِ انبیاءؐ کا حیات آفرین پیغام کون دے گا"۔ وہ اس فقرہ کو ایک خاص جوش اور ولولہ سے اپنے ذہن میں دہراتا۔ پھر اس کے پہلے سوال کی تمام تلخی ایک شیریں کیفیت میں بدل جاتی اور اس کی آنکھوں میں تشکر اور مسرت کے ہلکے ہلکے آنسو تیرنے لگتے۔

عابد کے دماغ میں تلخ و شیریں تصورات کی کشمکش ابھی جاری ہی تھی کہ "المبشر" سیسل برگ (Cecil Burgh) بندرگاہ کی گودی میں داخل ہو گیا۔ "المبشر" پر سوار تمام دیگر مبلغینِ دینِ متین باری باری عابد سے بغلگیر ہونے لگے۔ عابد جس بھائی سے بغلگیر ہوتا اپنے مشن کی کامیابی کے لئے دعا کی درخواست کرتا۔ جہاز آگے روانہ ہونے سے چند منٹ قبل امیر المبلغین نے اجتماعی دعا کرائی۔ "المبشر" عابد کو سیسل برگ (Cecil Burgh) چھوڑ کر تکمیل سفر کے لئے کراس ڈم (Cross-dom) ۔۔۔ روانہ ہو گیا۔

جہاز آناً فاناً عابد کی نظروں سے دور سمندر کی وسعتوں میں اوجھل ہوگیا۔ دارالاحمد کی سازگار فضا عزیز و اقارب کی ہمدردیوں، والدین اور بہن بھائیوں کی محبت اور دوستوں اور رفیقوں کے اخلاص سے بہت دور عابد "دارِ عدو" میں ساحلِ سمندر پر تن تنہا کھڑا اپنا لائحہ عمل وضع کرنے میں مشغول ہوگیا۔ "رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۝" اے میری قوتوں کے حقیقی مربی اور پروردگار، تو میرے سینہ سے ہر ایک قسم کی تنگی کو دور کرتے ہوئے اسے کھول دے اور تیرے اور تیرے پیارے کے پیغام کو مگر ہوں تک پہنچانے کے لئے مجھ پر جو فرض ڈالا گیا ہے اس کو ادا کرنے کے لئے مجھے طاقت اور توفیق بخش اور میری مشکلات کو آسان فرما۔ اور اگر میری زبان میں کوئی گرہ ہو تو اسے بھی کھول دے اور اسے کمال روانی اور شیرینی عطا کر تا لوگ میری بات سے اثر قبول کریں اور میری باتیں ان کے دلوں میں حلاوت اور آسانی سے اُتر جائیں۔"

عابد یہ دعائیں کرتا ہوا شہر کی طرف روانہ ہوا قلب شہر میں واقع "ہوٹل نوبلز" (Hotel Nobles) میں اس نے رات بسر کرنے کا ارادہ کیا رہائش کے لئے اسے ایک علیحدہ کمرہ مل گیا۔ رات کے ۹ بج رہے تھے۔ عابد نے مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی ادا کیں۔ پھر کھانا کھانے کے لئے ہوٹل کے مین روم (Main room) میں آیا۔ جونہی وہ مین روم میں داخل ہوا۔ اس کے کانوں میں آواز پڑی "یہ کراؤن لینڈ ریڈیو "وائس آف کراس" (Voice of Cross) ہے۔ اب ہمارا خصوصی پروگرام "دی فاؤنڈر آف اسلام" شروع ہوتا ہے"۔ عابد کے جذبات پیچ و تاب کھانے لگے۔ لیکن مجھے یہ تلخ نوائی برداشت کرنی ہوگی۔ اگر میں تنقید اعداء سننے کا متحمل نہیں ہوں گا۔ تو "وائس آف کراس" کو "وائس آف اسلام" کون بنائے گا۔" عابد نے کراؤن لینڈ کے اس سپیشل ریڈیو پروگرام کو پوری توجہ سے سُنا۔ سامعین کے چہروں سے اس نے اندازہ لگایا کہ یہاں کے باشندے اگر متعصبین نہیں تو لاجرم اس سے کم بھی نہیں۔ اس نے دیکھا کہ "وائس آف کراس" لوگوں کے جذبات کے ساتھ کھیلنے کا کردار بڑی کامیابی سے ادا کر رہا ہے۔ جونہی "دی فاؤنڈر آف اسلام" کا پروگرام شروع ہوا، تمام ہوٹل میں خاموشی طاری ہوگئی۔ اور پھر جوں جوں پروگرام نشر ہوتا گیا، سامعین کے چہرے بتدریج غصے اور غضب سے سُرخ ہوتے گئے۔ "وائس آف کراس" کا اندازِ تنقید بہت ہی جارحانہ تھا۔ پروگرام کا ڈائرکٹر پہلے ایک من گھڑت اتہام پیغمبر اسلام پر باندھتا اور پھر سامعین کے جذبات سے کھیلنے کے لئے کہتا "یہ ہے وہ انسان جو تمہارے خداوند یسوع مسیح کے درجہ کو گراتا ہے اور کہتا ہے کہ یسوع کو خدا ماننا ایک ایسا ظلم ہے کہ قریب ہے کہ اس ظلم کی

شدت سے آسمان ریزہ ریزہ ہوجائیں۔ دیکھو! مکہ کا رسول! کس دیدہ دلیری سے تمہارے خداوند یسوع مسیح کی تذلیل کرتا ہے۔ کون ہوشمند دل ہے عیسائیوں میں سے جو یہ الفاظ سن کر تڑپ نہیں جاتا۔ خداوند یسوع مسیح کے نام لیواؤ! اے مقدس صلیب کے رکھوالو!! اور اے تثلیث اقدس کے علمبردارو!!! چلے آؤ۔ مسیح کے اس سب سے بڑے دشمن کے خلاف محاذ میں شامل ہو کر خداوند کی خوشنودی حاصل کرو۔ دیکھو چودہ سو سال گذر گئے۔ محمدؐ کی باتوں کا کسی نے ایکشن نہ لیا۔ خداوند چاہتا تھا کہ یہ اعزاز کرائسٹ لینڈ کو ملے۔ پس اے کرائسٹ لینڈ کے رہنے والو! خوب کان کھول کر سن لو کہ اگر تم نے اس موقعہ کو گنوا دیا۔ اور مسیح کے متعلق محمدی عقائد کی تردید نہ کی تو تمہیں کبھی نہیں بخشا جائے گا۔ تم دنیا میں ذلیل ہو جاؤ گے اور خداوند یسوع مسیح کی توبیخ کے بھی مورد ٹھہروگے۔"

عابد اس صد درجہ جارحانہ طرز تخاطب کو سن کر دل تھام کر رہ گیا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا "اے "وائس آف کراس" کے فنکارو! محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا غلام سیل برگ میں آچکا ہے۔ وہ اپنے نبیؐ کے اسوۂ حسنہ پر قدم مارتے ہوئے بہت جلد "سیل برگ" کو "شہر بینا" اور "کرائسٹ لینڈ" کو "گلستانِ مصطفےٰ" میں تبدیل کردے گا۔

"وائس آف کراس" کے منتظمین کو تاریخ مسخ کرنے میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ وہ ہر ایسے واقعہ کو جس سے اسلام کی صداقت اور برتری ثابت ہوتی تھی۔ ایسے بھیانک انداز سے پیش کرتا کہ سننے والے اسلام کے متعلق سخت بدظن ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ وہ اسلام کو بھیڑیوں کا مذہب بیان کرتے۔ لفظ "اسلام" کا حوالہ دینے کی بجائے وہ اپنی نشریات میں بالعموم "مذہبِ سیف" کے الفاظ استعمال کرتے رسول اللہؐ کی زندگی کا نجران کے عیسائیوں کا واقعہ "وائس آف کراس" کے ذریعہ یوں براڈ کاسٹ کیا گیا

"سامعین! ایک روز نجران سے ہمارے بھائیوں کا ایک وفد مکہ کے رسولؐ کے پاس پہنچا۔ غلطی سے ہمارے بھائی مسلمانوں کی مسجد میں داخل ہوگئے۔ اس بات پر مسلمان اتنے مشتعل ہوئے ——— کہ انہوں نے ہمارے بھائیوں کو سخت ایذا رسانی کے بعد ان کے ناک کاٹ کر واپس نجران بھیج دیا۔ بھائیو! ہماری غیرت کب تک یہ کٹی ہوئی ناک کا واقعہ تاریخ میں پڑھتی رہے گی۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ اس "انفِ مقطوعہ" کا بدلہ چکایا جائے۔"

یہ براڈ کاسٹ سن کر عابد کے منہ سے بے اختیار نکلا "اللّٰھم اھدھم، اللّٰھم اھدھم انّھم لا یعلمون۔ انّھم ھم الجاھلون"

عابد خوب سمجھتا تھا کہ یہ پروپیگنڈا بالکل لغو اور بیہودہ ہے۔ مگر وہ اپنا تمام کام اس لائحہ عمل کے مطابق کرنا چاہتا تھا جو اس نے دعائے کلیمؑ کا ورد کرتے ہوئے تیار کیا تھا۔ "ہوٹل ٹویلرز" کی انتظامیہ

پر چند ہی دن میں اس کا تبحرِ علم واضح ہوگیا۔ وہ اس دوران آنٹر ہوٹل کے مالک کے پاس بیٹھ کر عہد نامہ قدیم وجدید سے ایسے حوالے سُنایا کرتا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سُنے تھے۔ وہ حیران تھا کہ اس نوجوان نے بائیبل کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ بائیبل کے ضابطہِ حیات کی کڑی کڑی کو پوری وضاحت سے جانتا ہے تاہم مسٹر ولیم ابھی یہ معلوم نہ کر سکا تھا کہ عابد مسلمان ہے اور ایک مسلمان یونیورسٹی سے باقاعدہ تعلیمات بائیبل کی خاص ڈگری۔ یعنی آنرز اِن ببلیکل لٹریچر" (B.A. Hons) بھی حاصل کی ہوئی ہے وہ عابد کے اخلاق واطوار اور پیاری طرزِ گفتار سے بہت متاثر ہوچکا تھا۔ ایک دن اس نے عابد سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ جان میموریل ہال (John Memorial Hall) [illegible] میں الیان سیسل برگ سے بائیبل کی تعلیمات پر خطاب کرے۔ عابد نے اس خواہش کو الٰہی تحریک پر محمول کرتے ہوئے پیشکش فوراً منظور کر لی۔ اور ولیم صاحب سے لیکچر تیار کرنے کے لئے ایک دن کی مہلت چاہی۔

اس اثناء میں لیکچر کے عام و دیگر انتظامات مکمل کر لئے گئے۔ پوسٹروں اور اشتہاروں کے علاوہ "وائس آف کراس" کے ذریعہ بھی عابد کے لیکچر کا اعلان کروایا گیا۔ جب عابد نے "وائس آف کراس" سے اپنے لیکچر کا اعلان سُنا تو بے اختیار کشتیٔ اسلام کے ناخدا کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ "آج سے وائس آف کراس" "وائس آف اسلام" میں تبدیل ہونا شروع ہوجائیگا"

جان میموریل ہال جس میں ایک لاکھ نفوس کے سمانے کی گنجائش تھی۔ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ مل رہی تھی۔ ہال کے اندرون وبیرون انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے۔ عابد لوگوں کے اس ذوق وشوق کو بھی خدائی تحریک سمجھ رہا تھا۔ اور یہ احساس اسے بار بار ڈھارس بندھاتا کہ کم از کم اس کا خدا ضرور اس کے ساتھ ہے۔ اور جب اس کا خدا اس کے ساتھ ہے تو یقیناً وہ آج کے دن جو پودا لگانے والا ہے وہ کل نہایت شیریں پھل دے گا۔ اس دوران صدرِ مجلس مسٹر جان ڈیوڈ ([illegible]) نے عابد سے تعلیماتِ بائیبل پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا۔ عابد نے ڈائس پہ آ کر اپنی تقریر شروع کی۔

"سب سے پہلے میں قادرِ مطلق کے نام سے اور اس کی تعریف سے اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہوں۔ جس نے اپنی خاص قدرتوں سے حضرت موسیٰؑ جیسے نبی، ہر ضعیف اور کمزور انسان کے ہاتھوں فرعون جیسے جابر اور سرکش انسان کا غرور توڑا۔ اور جس نے اپنی پنہاں در پنہاں طاقتوں سے سیدنا حضرت مسیح علیہ السّلام کو ناپاک اور بد باطن دشمنوں کے قبیح ارادوں سے محفوظ رکھتے ہوئے یونس نبی کے معجزہ کو ایک دفعہ پھر دہرایا۔ وہ خدا بڑی قدرتوں کا مالک خدا ہے۔ اس کے کام بڑے نرالے ہوتے ہیں۔

امّا بعد حضراتِ سامعین! خاکسار اس وقت

آپ کی خدمت میں بائیبل کی پیشگوئیوں پر مشتمل ایک لیکچر دینا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے کافی ان پیشگوئیوں کو بھول چکے ہیں۔ ہمیں ان پیشگوئیوں کو اکثر دہرانے رہنا چاہیئے۔ تاجب ان کے پورا ہونے کا وقت آئے۔ تو غیر کسی لیت ولعل کے ان کے پورا ہونے کی تصدیق کریں۔ حضرات! آج کے لیکچر میں، میں بائبل کی ان پیشگوئیوں کا ذکر کرونگا جن کا تعلق آئندہ زمانہ میں ہونے والے ایک برگزیدہ انسان سے ہے۔

عہدنامہ قدیم وجدید میں مختلف مقامات پر ایک جلیل القدر برگزیدہ انسان کے مبعوث کئے جانے کے متعلق پیش خبریاں موجود ہیں۔ میں ان میں سے بعض پیش خبریاں آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور آپ سے امید رکھتا ہوں کہ آپ دردِ دل سے ان پیشگوئیوں کے الفاظ پر غور کریں گے کیونکہ یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم ان قیمتی آیات کا بغور مطالعہ کریں۔

استثناء میں لکھا ہے "میری مانند ایک نبی برپا کرے گا" پھر اسی استثناء میں ایک اور جگہ مذکور ہے "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشین شریعت ان کے لئے تھی۔ ہاں وہ اس قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے وہ تیری باتوں کو مانیں گے" یوحنا کہتا ہے "میں تو تمہیں پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن وہ جو میرے بعد آتا ہے مجھ سے قوی تر ہے کہ میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں۔ وہ تمہیں روح قدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا" اعمال میں آیا ہے "اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالونگا اور جو کچھ میں اسے فرماؤنگا وہ سب ان سے کہیگا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کر کہیگا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا" متی میں آیا ہے "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا ..... اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا" پھر متی میں ہی وارد ہوتا ہے "دیکھو تمہارا گھر تمہارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے ہرگز نہ دیکھو گے۔ جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام پر آتا ہے" یوحنا کی کتاب میں مختلف مقامات پر آیا ہے "اور میں باپ سے درخواست کرونگا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشیگا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے، یعنی سچائی کا روح جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی" اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کرونگا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں" لیکن جب وہ مددگار

آئیگا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجونگا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا ۔ اور تم بھی گواہ ہو۔ کیونکہ شروع سے میرے ساتھ ہو۔" "میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤنگا تو اسے تمہارے پاس بھیجونگا ۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔" "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں ۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کرسکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا ۔ وہ میرا جلال ظاہر کریگا ـــــ" عابد نے ان اور ایسی ہی دیگر پیشگوئیوں اور ان کی تشریح پر گھنٹہ بھر ایک مبسوط اور جامع تقریر کی ۔ سامعین عابد کے تبحر علم سے بہت متاثر ہوئے ۔ "صدائے صلیب" نے اپنے دوسرے پروگرام ملتوی کرکے اسی شام عابد کی تقریر کا ریکارڈ نشر کیا ۔ اس طرح تمام عالم میں عابد کی آواز پہنچی ۔ وہ بہت خوش تھا ۔

"ہوٹل نوبلرز" کے جس کمرہ میں عابد رہتا تھا اب وہاں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ۔ لوگ ان پیشگوئیوں کے متعلق اس سے سوالات پوچھتے رہتے ۔ جب وہ یہ پوچھتے کہ آپ کا ان پیشگوئیوں کے متعلق کیا خیال ہے تو وہ صاف صاف کہہ دیتا کہ خدا کے نبیوں کی یہ پیشگوئیاں حق ہیں اور خدا نے انہیں ایک ایسے وجود میں حق کر دکھایا ہے جو چودہ سو سال کا عرصہ ہوا دنیا کو درس توحید دینے اور اپنا فریضہ ادا کرنے کے بعد عالم قدس میں بھی جا پہنچا ہے ۔ لوگ یہ سنکر حیران ہوتے ۔ وہ انہیں قرآن مجید کی آیات اور یورپین مصنفین کی لکھی ہوئی تاریخ اسلام کے حوالہ جات دیکر بائیبل کی پیش خبریوں کے پورا ہونے کی تصدیق کرتا ۔ تھوڑے ہی دنوں میں شہر کی کوئی درجن بھر سعید روحوں نے عابد کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا ۔ اور بائیبل کی ان پیشگوئیوں کے پورا ہوجانے کی خبر اپنے دوستوں اور عزیز و اقارب تک پہنچانے لگے ۔ عابد نے "وائس آف کراس" اور "بلائینڈ بین پبلشنگ کارپوریشن" کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ زور شور سے شروع کردیا ۔ ایک ماہ گذرا ہوگا کہ تمام شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ عابد مبلغ اسلام ہے کوئی شہری اس کے پاس نہ جائے ۔ عوام میں مخالفت کی آگ کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ ہوٹل والوں نے عابد کو ہوٹل چھوڑنے کا نوٹس دے دیا ۔ عوام نے کرائسٹ لینڈ کی حکومت پر زور دیا کہ عابد کو تبلیغ اسلام سے روکا جائے ۔ اور ملک بدر کیا جائے ۔ لیکن ان کی بدقسمتی کہ جب حکومت نے عارضی طور پر عابد کو نظربند کردیا تو عابد کے ہاتھوں اسلام لانے والے کرائسٹ لینڈ کے سب سے بڑے وکیل عمر نے یہ نکتہ اٹھا کر کہ ہمارے ملک کا آئین ہر مذہب کو کلی آزادی فکر دیتا ہے دوسرے ہی دن اپنے محسن عابد کو رہا کروا لیا ۔ اب عابد عمر کے گھر میں ہی رہنے لگا ۔

عابد نے اس دوران ملک کی قانون ساز اسمبلی کے تمام ارکان سے فرداً فرداً ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنی گفتگو اور اپنے اخلاق و اطوار سے ایسا متاثر کیا کہ وہ آئین کی "مذہبی آزادی" کی شق میں ترمیم کرنے کے مخالف ہوگئے۔ اور یہ قرار داد کہ آئین میں مذہبی آزادی کی شق اڑا دی جائے پاس نہ ہوسکی۔ کچھ عرصہ گذرنے پر ملک کی عام فضا تو صاف ہوگئی مگر اب "صدائے صلیب" اور "بلائینڈز پبلشنگ کارپوریشن" نے اپنی دجالی مساعی کو تیز تر کردیا۔ اب تو کذب و افتراء کے پچھلے تمام ریکارڈ مات پڑ گئے۔ مس کیتھرائن [redacted] ان دونوں اداروں کی ڈائرکٹر تھی اور رکن اسمبلی بھی۔ سیاسی وجاہت اور سرمایہ دار ہونے کے علاوہ کیتھرائن ملک کے لاٹ پادری کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس نے اب تمام کاروبار چھوڑ کر راہبہ کی زندگی اختیار کرلی۔ اور حلف اٹھایا کہ وہ نہیں مرے گی مگر اس حالت میں کہ وہ اسلام اور اسکے بانی کی مخالفت کی سعادت پارہی ہوگی۔ اس کو دیکھکر بعض اور عیسائی نوجوانوں اور لڑکیوں نے بھی ایسی زندگی اختیار کرلی۔ اور اسلام اور مبلغ اسلام عابد کے خلاف متحدہ کوششیں شروع کردیں۔

ادھر عابد کی تقریر کا اثر لوگوں پر اس قدر تھا کہ روزانہ کئی لوگ عابد کے پاس بحث و تمحیص کے لئے آتے اور ان میں سے اکثر عابد کی باتوں کو حق سمجھکر قبول کرلیتے۔ اور جب عابد "وائس آف کراس" اور "بلائینڈز کارپوریشن" کی غلط فہمیوں کی قلعی کھولتا اور یورپین مصنفین کی کتابوں سے انکے پروپیگنڈا کی تردید کرتا تو معترضین کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا۔ اور ان کی عقل سلیم انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کردیتی۔ عابد کے پاس بیٹھنے والوں میں سے کئی ایک کیتھرائن کو بھی ملنے جاتے اور اسے اصل حقیقت سے آگاہ کرتے۔ مگر وہ یہ کہکر بات کو ٹال دیتی کہ "میں مان ہی نہیں سکتی کہ جو بات محمدؐ کہتا ہے۔ وہ بھی درست ہوسکتی ہے۔" "وائس آف کراس" نے اپنی معاندانہ کوشش و سعی کو برابر جاری رکھا۔ عابد کا ردِ عمل اس کے برعکس محبت و پیار کا تھا۔ وہ کیتھرائن کو بھی ملتا۔ تو نہایت پُر تپاک طریق سے اور کہتا۔ "محترمہ! مجھے آپ کی مخالفت کا بے حد شکریہ ادا کرنا ہے۔ اگر آپ مخالفت نہ کریں۔ تو لوگ میرے پاس نہیں آتے۔ نہ میں انہیں غلط بیانیوں سے آگاہ کرسکتا ہوں۔ مجھے بہت خوشی ہے۔ کہ آپ میری مدد فرما رہی ہیں۔ میں تو ہر وقت دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ آپ کو مجھ سے بھی بڑھکر اجر عطا فرمائے۔ آپ میرا بہترین ساتھ دے رہی ہیں۔ اور ایک بات اور بھی بتا دوں۔ وہ یہ کہ مجھے پورا پورا یقین ہے وہ دن بہت قریب ہے کہ جب خدا آپ سے کام لے چکے گا تو وہ آپ کو بھی حلقہ بگوش اسلام کردیگا۔ آپ جس جوش سے اسلام اور میرے پیارے آقا کی مخالفت کرتی ہیں۔ وہ ظاہر کر رہا ہے کہ جلد یا بدیر کیتھرائن اس ملک میں اسلام کی

سب سے بڑی مؤیدہ ثابت ہوگی۔" کیتھرائن یہ باتیں سُن کر بڑی شدّ و مدّ سے ان کی تردید کر دیتی۔ اور بلند آواز سے کہتی "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں حق کو چھوڑ کر باطل پرست بن جاؤں۔ میری زندگی کی انتہا یقیناً آپ کے رسول ﷺ کی مخالفت میں ہوگی۔ ورنہ میں خداوند یسوع مسیح کے حضور سرخرو نہیں ہو سکتی۔"

عابد نے اس دوران اپنے وکیل بھائی ثمر کی مدد سے ایک پریس بھی خرید لیا۔ اور اب باقاعدہ اسلام کی تائید اور عیسائیت کی تردید میں لٹریچر شائع ہو کر متلاشیانِ حق کے پاس پہنچنے لگا۔

کیتھرائن اگرچہ بظاہر اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ مگر اس کا دل اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر چکا تھا۔ اور مسیحی عقائد کی کمزوریاں اس پر روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی تھیں۔ ایک رات جبکہ وہ سو رہی تھی تو اچانک اس کے منہ سے یہ کلمات نکلے "اسلام حق ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔" صبح اٹھنے پر والد نے ان کلمات کے متعلق استفسار کیا تو کیتھرائن نے ان کی صحت سے انکار کر دیا۔ اور کہا "پاپا! یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کیتھرائن مکّہ کے رسول ﷺ کی غلامی اختیار کرے یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دیکھو سورج مغرب سے طلوع کر رہا ہے۔" اگرچہ کیتھرائن بظاہر انکار کر رہی تھی۔ مگر اس کا لاشعور اس انکار کو سن کر حقیقتِ حال سے دوری کے باعث پانی پانی ہو رہا تھا۔

کیتھرائن کے حلقہ اثر میں بہت سے راہب مرد اور راہبہ لڑکیاں تھیں۔ ایک دن جب وہ چرچ میں قدرے دیر سے آئی تو اس نے اپنی آنکھوں سے ایک ایسا منظر دیکھا کہ قریب تھا کہ دفورِ حیا سے اس کے کانوں اور دماغ کے پردے پھٹ جاتے۔ اور دل بیٹھ جاتا۔ وہ نفوسِ انسانی رہبانیت کی روح کو ذبح کر رہے تھے۔ وہ اپنے فطری جذبات ضبط میں نہ رکھ سکے۔ ان کی جنسی خواہشات ان پر غالب آگئیں۔ تب یہ روح فرسا منظر دیکھ کر اس کے دل نے شہادت دی۔ کہ "دائس آف گراس" کا اسلام پر تعدد ازدواج کا بہتان ایک فریب ہے ایک حسین الزام۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شادی انسانی فطرت کا ایک ایسا خاصہ ہے کہ رہبانیت کی آہنی دیوار بھی اس خاصہ کے اظہار کو نہ روک سکی۔

ایک طرف کیتھرائن کے سامنے عیسائیت کے نظریات اور اس پر مکشاتِ عمل کی جھلک تھی دوسری طرف اس کے سامنے ان نومسلموں کا عملی نمونہ تھا جنہوں نے عابد کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا وہ اپنے مذہب کی ایسی جیتی جاگتی مثالیں تھیں کہ ان پر رشک آتا۔۔۔۔ اسلام نے کہا غضِّ بصر کرو۔ یہ مسلم نوجوان بازار میں جاتے ہیں ان کی نظریں سر بسر پاک ہیں۔ اسلام کہتا ہے شراب نہ پیو۔ ان نوجوانوں نے قبولِ اسلام کے روز سے ایسی شراب ترک کی ہے گو یا کبھی پی ہی نہ تھی۔ اسلام کہتا ہے روزانہ پانچ وقت خدا کی یاد میں جمع ہو

یہ مسلمان کبھی اس معاملہ میں سست گام نہیں ہوتے۔ اسلام کہتا ہے۔ غریب اور مظلوم کی حمایت کرو۔ یہ مسلمان حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں ایسے ثابت قدم نکلے ہیں کہ پہلے ایسے انسان میں نے نہ دیکھے تھے۔ یہی لوگ جو ہر قسم کی بدعنوانیاں کیا کرتے تھے۔ آج اسلام کے زیرِ اثر ان کے ارتکاب سے بکلی مبرا ہیں۔ ان کے اخلاق ایسے اعلیٰ ہیں کہ اپنے انتہائی مخالفین کی دلآزاری بھی پسندِ خاطر نہیں۔ تمام مذاہب کے پیشرو ان کی زبانوں سے "علیہم السلام" کی دعائیں حاصل کرتے ہیں۔ واللہ یہ لوگ تو فرشتے بن گئے ہیں۔ آخر ان کا یہ زبردست عملی مظاہرہ کس حقیقت، کس صداقت اور کس سچائی کا آئینہ دار ہے۔ کیا یہ اسی سچائی کی روح کا آئینہ دار تو نہیں جس کا ذکر بائیبل کی پیشگوئیوں میں ہے۔

چرچ کے بھیانک منظر کے مشاہدہ کے اگلے روز کیتھرائن عابد کو ملنے کے لئے "عمر اسلامک سنٹر" پہنچی گھنٹی بجائی عابد باہر آیا۔ ایک نقاب پوش خاتون باہر کھڑی تھی۔

"آپ کن سے ملنا چاہتی ہیں محترمہ!" "دار الاحمد سے آئے ہوئے مبلغِ اسلام عابد کو" "اچھا تو آپ کیتھرائن ہیں۔ نقاب اور کیتھرائن!" "اے مبلغِ اسلام! اب تو مجھے کیتھرائن نہ کہو! میں نے اپنا نام "عابدہ" رکھ لیا ہے اور یہ نقاب میں نے اس لئے پہنا ہوا ہے کیونکہ میں "عابدہ" ہو کر عابد کو بغیر پردہ کے نہیں مل سکتی" "تو کیا آپ نے اسلام قبول کر لیا ہے؟" "ہاں عابد!

میں مصطفیٰؐ کے ہاتھ پر اسلام لائی ہوں
عشقِ خدا کی مے کا بھرا جام لائی ہوں

آج مجھ پر بھی محمدؐ کا جادو ہو گیا۔ افسوس میں بڑی دیر کے بعد اس جادو کا مطلب سمجھ پائی۔ لاریب آقائے نامدارؐ نے تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اپنے اسوۂ حسنہ اور عمل کی کمال خوبصورتی سے اپنے دشمنوں کو زیر کیا آج کرائسٹ لینڈ میں ان کے ماننے والوں کے اعمال پر جب میں نظر کرتی ہوں تو میرا دل خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوا جا رہا ہے۔ اور بے اختیار میرے منہ سے نکل رہا ہے۔ "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔" اسلام یقیناً حق ہے۔ اسلام یقیناً مذہبِ فطرت ہے وہی مذہبِ فطرت جس کی صداقت کی گواہی ہر پیدا ہونے والا بچہ دیتا ہے۔ جس کی صداقت کی گواہی دینے کے لئے لاشعور بھی جوش میں آ جاتا ہے اور دشمنوں کی زبان پر بھی بے ساختہ جاری ہو جاتا ہے۔" "اسلام حق ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔" "اے مبلغِ اسلام دعا کرو۔ کہ میں اپنی تمام زندگی کو مصطفیٰؐ کی خدمت میں ایک باعمل مسلمان کی حیثیت سے لگا دوں۔"

اسلام کی ایک شدید دشمن کے یہ کلمات سنکر عابد نے زور سے "اللہ اکبر" کہا۔ اور پھر وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "عمل کے اندر کتنی بڑی طاقت ہے۔ کتنا زبردست جادو ہے کتنی عظیم الشان کشش ہے۔ عمل یقیناً ایک ایسی پراثر تلوار ہے کہ قلبِ انسانی کو فتح کرنے کیلئے اس سے بڑھکر اور کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا۔" (۱۹ اپریل ۱۹۶۳ء)

ارشد ترمذی

کالج کے شب و روز!

امتحانات ان دنوں ہر طالبعلم کے سر پر امتحان کا خوف مسلط ہے ہر آزاد طبع سے آزاد طبع طالبعلم بھی ان دنوں کتابی کیڑا نظر آتا ہے۔ کالج کی رونق غیر معمولی طور پر کم ہوگئی ہے۔ اب جبکہ زیر نظر شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے گیارھویں اور بارھویں کے طلبا، قلموں اور دواتوں سے مسلح ہو کر رزمگاہ امتحان میں برسرپیکار ہیں۔ بقیہ کلاسیں بھی عنقریب اس سے دوچار ہونیوالی ہیں۔ امتحانات کا دور جس کا آغاز ماہِ اپریل سے ہوگیا ہے جون کے آخر تک جاری رہے گا۔

سالانہ کھیلیں تعلیم الاسلام کالج کی سالانہ کھیلیں ۱۳ اور ۱۴ مارچ کو کالج گراؤنڈز میں منعقد ہوئیں۔ ۱۳ مارچ کو محترم پرنسپل صاحب نے ان کھیلوں کا افتتاح کیا۔ کھیلوں میں طلبہ کے علاوہ ممبرانِ سٹاف نے بھی گہری دلچسپی سے حصہ لیا۔ طلبہ کے مقابلوں کے علاوہ سٹاف میوزیکل چیئرز ریس، سٹاف چلڈرن ریس اور سرونٹس ریس کے مقابلے خاص دلچسپ تھے۔ سٹاف میوزیکل چیئرز میں محترم ڈاکٹر سلطان محمود صاحب شاہد اول رہے۔ طلبہ میں سے سراج الحق قریشی کو سالِ رواں کا بہترین اتھلیٹ قرار دیا گیا، مجموعی لحاظ سے بی۔ اے سال دوم اول رہی۔ کھیلوں کے اختتام پر محترم صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب نے کامیاب کھلاڑیوں میں انعامات تقسیم فرمائے اور ایک نہایت بصیرت افروز تقریر کی۔

تعلیم الاسلام کالج یونین

کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثے:۔ عرصہ زیر رپورٹ میں کالج یونین کے سالانہ کل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی، اردو مباحثات منعقد ہوئے۔

ٹرافی:۔ نور محمد چانڈیہ اور سید مشہود احمد شاہ نے گورنمنٹ کالج جوہرآباد کے کل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثہ کی ٹرافی بالترتیب دوم اور سوم انفرادی انعامات حاصل کرکے جیتی۔

انفرادی انعامات:۔ (۱) نور محمد چانڈیہ نے گورنمنٹ کالج جوہرآباد کے کل پاکستان انگریزی مباحثہ میں دوسرا اور اسلامیہ کالج لائل پور کے کل پاکستان انگریزی مباحثہ میں تیسرا انعام حاصل کیا۔

(۲) سید مشہود احمد شاہ نے کالج آف ایجوکیشن لاہور کے انگریزی مباحثہ میں تیسرا انعام حاصل کیا اسی طرح گورنمنٹ کالج جوہرآباد کے سالانہ انگریزی مباحثہ میں بھی تیسرا انعام حاصل کیا۔

(۳) ارشد ترمذی گورنمنٹ کالج جھنگ کے کل پاکستان بین الکلیاتی مشاعرہ میں تیسرا انعام حاصل کیا۔

(۴) جاوید حسن نے کالج آف اینیمل ہسبنڈری کے سالانہ اردو مباحثہ میں تیسرا انعام حاصل کیا۔

مجلسِ ارشاد:۔ مجلسِ ارشاد کی دعوت پر مولانا محمد حنیف صاحب ندوی رکن ادارہ "ثقافت" نے "اسلام کے دیگر مذاہب پر احسانات" کے موضوع پر ایک خیال افروز تقریر کی۔

مجلسِ فارسی:۔ پروفیسر آقائے رازی پنجاب یونیورسٹی نے "جدید فارسی" کے موضوع پر ایک دلچسپ تقریر کی۔

مجلسِ اقتصادیات:۔ ڈاکٹر ایس ایم اختر صدر شعبہ اقتصادیات پنجاب یونیورسٹی نے "مسئلہ آبادی" پر تقریر کی۔

مجلسِ عربی:۔ مکرم ملک مبارک احمد صاحب نے "عربی زبان کی خصوصیات" مکرم شیخ نور الحق صاحب تنویر نے "امثال القرآن اثرھا فی الادب العربی" اور مکرم شیخ نور احمد صاحب منیر نے "اعجاز القرآن" کے موضوعات پر عربی زبان میں تقاریر کیں۔

ہوسٹل (۱) محترم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک نہایت ہی دل نشین اور پر اثر تقریر فرمائی۔

(۲) مکرم مولوی غلام باری صاحب سیف نے نہایت فاضلانہ انداز میں "فضائل قرآن مجید" کے موضوع پر طلباء دار الاقامہ سے خطاب کیا۔

(۳) ہوسٹل کی بزمِ خدام الاحمدیہ کے زیر اہتمام مولینا دوست محمد صاحب نے "تاریخ احمدیت" مکرم صوفی بشارت الرحمٰن صاحب ایم۔ اے نے "قبولِ حق میں مشکلات"۔ مکرم قریشی اسد اللہ خان صاحب کاشمیری نے "حضرت مسیح ناصری کی کشمیر میں آمد" اور مکرم مولانا ابو العطاء صاحب جالندھری نے "نظامِ وصیت اور اس کی اہمیت" پر تقاریر کیں۔ ایک اجلاس میں خدام پر سنیما بینی کے بُرے اثرات واضح کئے گئے۔

یومِ اُردو:۔ مولانا صلاح الدین احمد نے طلبہ سے خطاب کیا۔

ہمیں بعض اوقات اس قسم کے عنوانات پر لکھی ہوئی نگارشات موصول ہوتی رہتی ہیں مثلاً "علم کے نقصانات" "شور و غل کے فوائد" وغیرہ وغیرہ۔ ہم اپنے محترم دوستوں سے گذارش کرتے ہیں۔ کہ اس قسم کا تخریبی طرزِ فکر ہمارے معاشرہ کی نشو و نما کے لئے مضر ہے ہمارے طلباء کی نگارشات خالصتاً تعمیری رنگ میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہئیں۔ یہی اس درسگاہ کے طلباء کے شایانِ شان ہے۔

(ادارہ)

شاہد احمد

ہمارے سالانہ مباحثے

جیسا کہ آپ سب کو علم ہے کہ کالج میں مختلف مجالس اور سوسائٹیاں قائم ہیں۔ اور ہر سال ان کے الیکشن ہوتے ہیں — یہ مجالس اپنے اپنے رنگ اور مناسبت سے تمام سال مختلف قسم کی تقاریب کا اہتمام کرتی رہتی ہیں — ان میں سے سب سے بڑی مجلس "کالج یونین" ہوتی ہے۔ یہ گویا "اُم المجالس" ہے — اسی یونین کے تحت ہم سارا سال — بہت سی دلچسپ — اور اہم تقریبات سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں — خیر سے۔ جس طرح اس کا "افتتاح" نہایت شاندار طور پر ہوتا ہے اسی طرح اس کا — "اختتام" بھی نہایت ہی پُر وقار اور دلچسپ رنگ میں ہوتا ہے — موجودہ سیشن کی یونین اب اپنی — "پیدائش" — کے بعد اپنے "اختتام" کو پہنچ چکی ہے۔ اور اب تو گویا — وہ "آخری" — مراحل طے کر رہی ہے۔

خیر یہ تو تمہیدی بیان تھا۔ آمدم برسر مطلب! تقریباً ہر سال — ہمارے مباحثے فروری میں منعقد ہوا کرتے تھے مگر امسال رمضان المبارک کی وجہ سے ان کا انعقاد فروری کی بجائے مارچ میں ہوا ہمارے کالج کے ربوہ میں آنے کے بعد یہ نویں بین الکلیاتی مباحثے تھے۔ اور ہم بھی ان کو نہایت باقاعدگی سے گذشتہ نو سال سے سنتے چلے آ رہے ہیں یہاں پر یاد آیا — جب ہم مدرسہ میں پڑھتے تھے تو — یہ چیز ہمارے لئے پریشان کن تھی — یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک صاحب — ایک جانب سے آتے ہیں — دوسرے، دوسری جانب سے ......!! "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے"۔ کی فلاسفی آخر کالج آ کر ہی کھلی۔

امسال — مباحثوں کے لئے ۹ اور ۱۰ مارچ کی تاریخیں مقرر ہوئیں — یونین کی طرف سے پوری پوری کوشش کی گئی — کہ حسب سابق ہمارے مباحثے شاندار طریقے پر منعقد ہوں — اور اس میں وہ کامیاب بھی رہی۔ آخر وہ دن بھی آ ہی گئے۔

ع دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے

نو مارچ — شام کے ۶½ بجے — کالج ہال میں — انگریزی مباحثہ تھا۔ ٹھیک ۶½ بجے — کالج یونین کے عہدیدار — محترم پرنسپل صاحب اور جناب ڈاکٹر شاہد صاحب انچارج کالج یونین — کی معیت میں ایک پُر وقار جلوس کی شکل میں کالج کے ہال میں داخل ہوئے — حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے — یہاں تک کہ — عہدیدار حضرات — اپنی اپنی کرسیوں پر تشریف فرما ہو گئے — ازاں بعد سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ "جناب ارشد ترمذی

نے مباحثہ کے آغاز کا اعلان فرمایا۔

تلاوت قرآن کریم کے بعد ——— سیکرٹری کالج یونین ——— سید مشہود احمد شاہ ——— نے مباحثہ کے قواعد و ضوابط پڑھکر سُنائے ——— بعد ازاں صاحب صدر نے منصفین حضرات کا تعارف کروایا ——— اس مباحثے کے منصفین ——— مسٹر ڈیل، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر برٹش کونسل لاہور (منصفِ اعلیٰ) ڈاکٹر فلپ، پروفیسر سوشیالوجی پنجاب یونیورسٹی لاہور اور مسٹر ولیم مائیکل لیکچرار فزکس ٹی۔آئی کالج ربوہ تھے۔

موضوع زیرِ بحث تھا:۔

"Mariage is a farewell to peace of mind."

(یعنی شادی سے ذہنی سکون رخصت ہو جاتا ہے)

موضوع ——— اہم ہونے کے علاوہ ——— دلچسپ بھی تھا ——— سب سے پہلے ——— قائد ایوان کی حیثیت سے ——— "طویل القامت" عزیز میاں مشہود احمد شاہ ——— تشریف لائے ۔ حاضرین نے ——— خوب گرمجوشی ——— اور "نعروں" ——— سے موصوف کا استقبال کیا ——— بعد ازاں آپ نے تقریر ——— جو کافی تیاری ——— سے "تیار" کی گئی تھی ——— شروع کی ——— آپ نے ——— شادی کے خلاف ——— ایسی ایسی پُراثر دلیلیں دیں ——— کہ اس وقت ایوان کی ایک اچھی خاصی تعداد کا ذہنی سکون ——— رخصت ہو گیا۔ دلائل و براہین کے چکر میں عزیز میاں قائد حزب اختلاف کو بھی کئی کھٹی میٹھی ڈرمیں لگاتے رہے۔

قرارداد کی مخالفت میں جناب نور محمد چانڈ یہ نے ——— ایک دھواں دھار تقریر کی ——— معاف کیجئے گا ——— بندہ نے "دھوآں" کا لفظ استعارہ کے رنگ میں استعمال کیا ہے ۔ "لوکوموٹو" والا دھوآں ابھی ہمارے مقررین استعمال کرنے سے واقف نہیں ہوئے ۔ جناب قائد اختلاف نے قائد ایوان کی طرف سے پیش اور عائد کردہ الزامات کا "تسلی بخش" بلکہ سکوت بخش جواب دیا ——— آپ کے "دلائل قاطعہ" ——— سے حاضرین کافی محظوظ ہوئے ——— ذہنی سکون ——— جو کچھ عرصہ قبل "رخصت" ہو گیا تھا ——— دوبارہ بحال ہوا۔

بعد ازاں گورنمنٹ کالج لائلپور۔ گورنمنٹ کالج لاہور، گورنمنٹ کالج بہاولپور، گورنمنٹ کالج جوہرآباد، لاء کالج لاہور، مرے کالج سیالکوٹ اگریکلچرل یونیورسٹی لائلپور، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور اور ینگ سپیکرز یونین ربوہ کے مقررین نے باری باری تقاریر کیں ۔ جب صاحب صدر نے ایوان کی رائے لی ——— تو قرارداد بہت بھاری اکثریت سے ردّ ہو گئی ——— سننے میں آیا ہے کہ کالج کے "میاں شادی" نے قرارداد کو ردّ کرانے کے لئے ہال میں غیر قانونی کنولیسنگ بھی کی ۔ ماہرین نے کنولیسنگ کے پیچھے یہ راز معلوم کیا ہے کہ موصوف کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ کالج جس سے عرصہ ہوا اس کی شادی ہوئی تھی غلط دلائل کے رعب میں آکر اس کے خلاف "ذہنی پریشانی" کی رٹ نہ کر دے۔

منصفین حضرات کے فیصلے کے مطابق ——
مظہر الاسلام، مرے کالج سیالکوٹ اوّل، ریاض حسین گورنمنٹ کالج لاہور دوم —— اور اسمٰعیل منیر گورنمنٹ کالج بہاولپور نے سوم انعام حاصل کیا ——

تقریباً ۹ بجے شب —— یہ مباحثہ اختتام پذیر ہوا۔ "وقفہ انتظار" میں ایک صاحب نے نعتیہ اشعار پیش کر کے حاضرین کو خوب محظوظ کیا۔ اور منصفین کے فیصلہ کا انتظار جو کہ "اشد من الموت" ثابت ہو سکتا تھا عین "روح افزا" بلکہ موسم کی مناسبت سے "چائے کی پیالی" ثابت ہوا۔

اردو مباحثہ

اگلے روز ٹھیک سات بجے اردو مباحثہ منعقد ہوا —— مباحثے سے قبل باہر سے آنے والے مہمانوں، مقررین —— اور مقامی معززین —— اور "یونین کے بھاردوں" —— کی خدمت میں کالج یونین کی طرف سے ایک پُر تکلف عشائیہ ترتیب دیا گیا —— مدعوین —— ڈنر سے —— اور دیگر سامعین اپنے اپنے گھروں سے —— سیر ہو کر —— عین وقت پر مباحثہ سننے کے لئے پہنچ گئے

اردو —— مباحثے کے منصفین —— جناب مرزا عبدالحق، ایڈووکیٹ سرگودھا (منصف اعلیٰ) جناب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم مدیر ہفت روزہ "لیل و نہار" اور جناب ڈاکٹر حمید الدین صدر شعبۂ فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور تھے۔ مباحثہ میں زیر بحث موضوع تھا۔

"پاکستان کو سیاستدانوں کی نہیں
سائنسدانوں کی ضرورت ہے"

ایوان کی قیادت —— عطاء المجیب راشد —— اور حزب اختلاف کی قیادت —— جاوید حسن —— کر رہے تھے۔ —— سب سے پہلے —— قائد ایوان —— اپنی روایتی شان، تحمل اور خود اعتمادی کے ساتھ تشریف لائے —— اور قرارداد برائے بحث پیش کی۔ آپ نے اپنی تقریر کے اوائل میں ہی —— جوش بھری طرح —— پاکستان کے سیاستدانوں —— کو "رگیدا" اور لتاڑا —— گویا "ایڈوو" —— نے ان کی ابھی کچھ خدمت ہی نہ کی تھی۔ پھر آپ نے سائنس کی اہمیت، سائنسدانوں کی ایجادات اور ان کے بیش بہا احسانات کا ذکر کرتے ہوئے —— نہایت ہی درد بھرے لہجے میں یہ فرمایا کہ

"بس صدر محترم! "پاکستان کو سیاستدانوں کی نہیں سائنسدانوں کی ضرورت ہے"۔

اس کے بعد —— "نوعمر" —— اور مقبول قائد ایوان —— "ننھے منے" —— قائد حزب اختلاف —— جاوید حسن تشریف لائے۔

آپ نے آتے ہی قائد ایوان —— کو ہاتھوں ہاتھ لیا —— اور ان کی بہت سی باتوں کی تردید کرنے —— اور ان کو بہت سے مشورے دینے کے بعد سیاستدانوں —— کا "دفاع" کیا —— یوں معلوم ہوتا تھا گویا سیاستدانوں کی حیات جاودانی بس عزیزم جاوید سے ہی منسلک ہو کر رہ گئی ہے۔

آپ نے کہا —— کہ اصل میں ہم کو سیاستدانوں کی ضرورت کے علاوہ سائنسدانوں —— کی بھی بطور —— "مددگار" ضرورت ہے۔

بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور، جھنگ، گوجرانوالہ، بہاولپور، سرگودھا، اسلامیہ کالج لائلپور، میونسپل کالج لائلپور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، دیال سنگھ کالج لاہور اور ایگریکلچرل یونیورسٹی لائلپور کے مقررین نے موضوع کے حق اور مخالفت میں تقاریر کیں۔ جب صدر جلسہ نے ایوان کی رائے لی تو قرارداد بھاری اکثریت سے مسترد ہو گئی۔

—— مگر صدر محترم نے اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے اسے منظور قرار دیا۔ منصفین حضرات کے فیصلے کے مطابق عبدالرشید قریشی پنجاب یونیورسٹی لاہور اوّل۔ وقار احمد ظہیر اسلامیہ کالج لائلپور دوم اور الطاف احمد سلیانہ گورنمنٹ کالج جھنگ سوم قرار پائے۔

—— بعد ازاں محترم صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم نے کامیاب مقررین میں انعامات تقسیم فرمائے۔ اور حاضرین کے اصرار پر اپنا اردو —— اور پنجابی منظوم کلام بھی پیش کیا۔ جس سے حاضرین نے خوب حظ اٹھایا۔

آخر میں مکرم ڈاکٹر سلطان محمود صاحب شاہد انچارج کالج یونین —— نے مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا جس کے بعد صدر مجلس جناب ارشد ترمذی نے مباحثہ کی برخاستگی کا اعلان فرمایا۔ اور اس طرح کالج یونین کے یہ نویں سالانہ بین الکلیاتی مباحثات اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ بہت کامیابی اور خیر و خوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئے۔

بقیہ آپ کے خطوط

مکرمی جاوید صاحب!

عرصہ کے بعد المنار کے گزشتہ شمارہ کی جھلک نصیب ہوئی۔ ماشاء اللہ! بڑی تندہی سے مرتب کیا ہوا تھا۔ رسالہ معنوی و صوری ہر دو لحاظ سے خوبصورت تھا۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا کا مضمون بہت پسند آیا یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نجم صاحب لکھتے لکھتے مجسم سوز و درد بن جاتے ہیں۔ وطن کی محبت اب ہمارے دلوں میں کچھ ٹھنڈی پڑ رہی ہے نجمی صاحب کو اللہ جزائے خیر دے وطن کی خاطر قربانی کے جذبہ کو انہوں نے افسانہ میں خوب نبھایا ہے "غیرت کا امتحان" افسانہ پڑھ کر مجھے آج کی کلچر کی دلدادہ خاتون پر افسوس ہوا —— کاش ہمارے معاشرہ کی ہر خاتون ادتی کی مانند غیرت و حمیت کی نگہبان بن جائے۔ عابد صاحب نے فلاں ابن فلاں میں خود غرض اور موسم بہار کے دوستوں پر طنز کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس زمانہ میں حقیقی دوست کی تلاش ایک سعی بے نتیجہ سے زیادہ حقیقت نہیں زمانہ کی ہوا پھر چکی ہے۔ محبت کا مضمون پڑھ کر وجد طاری ہو گیا۔ حضرت قاضی صاحب نے کس دنیا میں جا کر یہ مضمون لکھا ہے۔ محمود اصغر صاحب نے "اتفاق ضروری نہیں" کے تحت جو کچھ لکھا۔ انہیں مطلع فرما دیں کہ مجھے ان سے کلی اتفاق ہے۔

حصہ نظم میں ارشد ترمذی صاحب کا رنگ تغزل بہت بھایا۔ ان کا یہ شعر بہت پسند آیا ؎

ساقیا آج تو جی بھر کے پلا دے پی لے
یوں نہ پچھتائے گی کبھی کالی گھٹا میرے بعد

(بشیر احمد)

تعارف

ابُوالفراق

چند جانے والے!

اعجاز الحق قریشی

"المنار" حصہ انگریزی کے مدیر اعلیٰ اردو و انگریزی کے اچھے انشاء پرداز، کامیاب مقرر اور ایک ہونہار طالب علم ہیں ۱۹۶۰ء میں آپ نے ہائر سیکنڈری سکول امتحان میں بورڈ بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی اور ۱۹۶۲ء میں بی اے آنرز سال دوم کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں لڑکوں میں اوّل رہے۔

ارشد ترمذی

تعلیم الاسلام کالج یونین کے صدر انور شاہ ارشد ترمذی کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے روحِ رواں ہیں گذشتہ سالوں میں آپ "المنار" کے مدیر اعلیٰ، مجلسِ ارشاد کے معتمدِ اعلیٰ، پراکٹوریل مانیٹر اور مجلس فارسی کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ اردو کے ایک اعلیٰ پایہ کے انشاء پرداز اور مقرر اور اردو و فارسی کے ایک اچھے شاعر ہیں۔ متعدد کالجوں کے کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثوں اور مشاعروں میں کالج کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ نہایت سلجھا ہوا اندازِ فکر پایا ہے اسلامی روایات اور تعلیمات میں سمرئے ہوئے ادب کے مؤید اور دلدادہ ہیں۔

.....

.....

.....

غلام رسول آشنا

تعلیم الاسلام کالج میں گذشتہ تین سال سے والی بال اور غلام رسول آشنا کا نام ساتھ ساتھ آرہا ہے کالج کے والی بال کے بہترین کھلاڑی اور ٹیم کے کپتان ہیں بہت سی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں ہر کام نہایت فرض شناسی اور جانفشانی سے انجام دیتے ہیں اپنی خصوصیات کے باعث اساتذہ اور طلبہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں آپ کالج یونین کے چیف سٹیورڈ ہیں۔

محمود اکبر بھٹی

فضل عمر ہوسٹل کے چیف پریفیکٹ اور ہوسٹل یونین کے صدر ہیں۔ بہت سی اعلیٰ انتظامی قابلیتوں کے مالک ہیں۔ گذشتہ سال مجلس اقتصادیات کے نائب صدر تھے۔ طلبہ میں بہت مقبول ہیں۔

منیر احمد مرزا

کشتی رانی کے ایک اچھے کھلاڑی ہیں اور گذشتہ سال یونیورسٹی ٹیم کے کپتان رہے ہیں۔ کرکٹ اور کیڈی بھی کھیلتے ہیں۔ مجلسِ فلسفہ و نفسیات کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

خلیق انجم

کالج کے مقبول ترین طلبہ میں سے ہیں انگریزی اور اردو کے مقرر اور فٹ بال کے کھلاڑی ہیں مختلف مشاعروں میں کالج کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ آپ گذشتہ دو سال

سے یونیورسٹی نٹ بال ٹیم کے سیکرٹری چلے آرہے ہیں۔

سلطان احمد

باسکٹ بال کے بہترین کھلاڑیوں میں سے ہیں۔ کھیل میں اپنی غیر معمولی پھرتی اور تیزی کے باعث "شرلی" کے نام سے مشہور ہیں۔ گذشتہ تین سال سے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انٹر یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں شریک ہو رہے ہیں۔ سنٹرل زون کے منتخب کھلاڑی ہیں۔

نور محمد جانڈیہ

کالج کے بہترین انگریزی مقرر ہیں۔ بیشتر کل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثات میں شرکت کی۔ سالِ رواں میں فشر میڈیکل کالج ملتان اور گورنمنٹ میڈیکل سکول بہاولپور سے اوّل، گورنمنٹ کالج جوہرآباد سے دوم اور گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد اور اسلامیہ کالج لائلپور سے سوم انعامات حاصل کئے۔

رشید احمد جاوید

"المنار" کے حصہ اردو کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ اردو کے ایک سلجھے ہوئے انشاء پرداز اور افسانہ نگار ہیں مجلس ارشاد کے معتمد اعلیٰ ہیں۔ گذشتہ سال آپ مجلس اقتصادیات کے صدر تھے۔ متعدد کل پاکستان بین الکلیاتی تحریری اور تقریری مقابلہ جات کے علاوہ حسنِ قرأت کے مقابلوں میں بھی کالج کی نمائندگی کرتے رہے ہیں امسال آپ نے مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے کل پاکستان مقالہ نویسی کے مقابلہ میں اوّل انعام حاصل کیا۔ گذشتہ سال آپ اردو کالج کراچی کے کل پاکستان بین الکلیاتی تحریری مقابلہ میں دوم رہے تھے۔

مشہود احمد شاہ

کالج یونین کے سیکرٹری سید مشہود احمد شاہ انگریزی کے اعلیٰ پایہ کے مقرر ہیں۔ متعدد کالجوں کے کل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثوں میں کالج کی نمائندگی کی ہے۔ اس سال آپ نے نشتر میڈیکل کالج ملتان سے دوسرا اور جوہرآباد سے تیسرا انعام حاصل کیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۱۹)

دوسری غزل کا یہ شعر پڑھکر ؎

روئے زیبا کی اک جھلک کیلئے ؎ کتنا بیتاب و بیقرار ہوں میں۔

ارشد صاحب کی بیقراری دیکھنے کو دل چاہا۔ افسوس!! دوری آڑے آئی۔ "زندگی" کا ایک پرچہ بھیج رہا ہوں رائے کا انتظار کرونگا۔ والسلام خاکسار حفیظ اظہر۔ رحیم یار خاں۔

؎ مکرمی جاوید صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گذشتہ دو تین سال سے بالاستیعاب المنار کے مطالعہ کا موقعہ مل رہا ہے المنار میں اسلامی قدروں کا جو لحاظ رکھا جاتا ہے وہ بیحد قابلِ ستائش ہے عام طور پہ کالجوں کے رسالوں میں دیکھا گیا ہے کہ انکا زیادہ ذہن تعیش کے سامان سے ہی مزین ہوتا ہے۔ جبکہ المنار کی انفرادیت ہے اور اسے ہمیشہ قائم رکھنا چاہیئے۔" آپکے افسانے میں شوق سے پڑھتا ہوں کیونکہ ان میں اسلامی مخالطہ حیات کی تصویر کشی کی ہوتی ہے اگر میں[۲۲]

---

۲۲ یہ کہوں کہ آپنے اپنے افسانوں میں اسلامی نظریات کو ڈھالنے کی پہلی کامیاب کوشش کی ہے تو شاید غلط نہ ہو۔ اس زمانہ کی "نئی روشنی" میں اسلامی اقدار کی عظمت پہ "افسانوی ادب میں کچھ لکھنا یقیناً ایک قابلِ قدر اقدام ہے۔ والسلام خاکسار رشید الدین انور نیاز نگر

آپ کے خطوط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرمی ایڈیٹر صاحب "المنار"

اپنے محبوب کالج کے شاندار روایات کے حامل مجلہ سے کسے محبت نہ ہوگی؟ کم از کم میں تو اپنے پیارے "المنار" کیلئے محبت کے بہت ہی لطیف جذبات محسوس کرتا ہوں یہی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شمارہ نظر سے رہنے نہ پائے۔ ایک خاص فیچر جو میں نے نئے شماروں میں محسوس کیا ہے وہ یہ ہے کہ اب المنار کے تقریباً تمام مضامین (خصوصاً حصہ اردو کے) یکسر اس اسلامی قالب میں ڈھلے محسوس ہوتے ہیں جس کا تقاضا تعلیم الاسلام کالج کا تقدس بھرا ماحول کر سکتا ہے۔

اس ضمن میں میں یہاں صرف ایک افسانہ موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو اے دل"۔ کا ذکر کروں گا۔ یہ افسانہ میرے دلی جذبات کا ایک نہایت ہی حسین و جمیل مرقع ہے ہو سکتا ہے کہ عملی زندگی میں میں محمود کے کردار کی بلندی کو کبھی بھی نہ پہنچ سکوں لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ یہ بلندی مجھے ہمیشہ ہی دعوتِ عمل دیتی رہے گی۔ یہ دلچسپ افسانہ اسلامی اخلاقِ فاضلہ مثلاً محبت، اخوت، ہمدردی، ایثار، غیرتِ ملی و قومی، دعا، توکل علی اللہ اور تبلیغ ہدایت کے حسن کو بڑی دلکشی سے اجاگر کرتا ہے آج ضرورت ہے کہ ہمارا ہر تحریر اسی رنگ میں رنگین ہو کیونکہ مادرِ وطن کے بے شمار فرزند، زندگی کے ہر شعبہ میں مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید میں ہی تسکین محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس کامیاب کوشش پر میں لکھنے والے بھائی کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خاکسار لال خان

انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم مدیر اعلیٰ "المنار"

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"المنار" کا تازہ شمارہ نظر سے گذرا۔ سب سے پہلے جو چیز متاثر کرتی ہے وہ اس شمارے کی سادگی اور پھر کتابت اور چھپائی کا اعلیٰ معیار ہے۔ اور شمارہ ہذا کے مضامین بھی ایسے ہیں کہ قاری پر ان کی افادیت اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

اس شمارے کے اداریے میں آپ نے تعلیمی اصلاحات کا نہایت شاندار تجزیہ کیا ہے۔ میں آپ کو اس اداریہ پر مبارک باد دیتا ہوں۔

"طلب علم" جیسے قیمتی مضمون کی اشاعت نہایت بامو قع ہے اور اپنے نہایت مفید مضمون کے لحاظ سے آجکل کے بھٹکے ہوئے طلباء کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

ہر مسلمان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے

عشق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں "غزوۂ بدر کے ایمان افروز واقعات" واقعی ازدیادِ ایمان کا موجب ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان واقعات کو پڑھتے ہوئے میری آنکھیں نمناک ہوگئیں اور یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ہم بھی اس وقت ہوتے!

حضرت قاضی اکمل صاحب نے "محبت" پر نہایت پائے کی انشا پردازی کرکے ہمیں بھی محبت سے محبت پیدا کردی۔ نفس مضمون نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ساقیٔ صادق (علیہ السلام) کے الفاظ میں خوب پلایا۔ اس مضمون میں اللہ تعالیٰ سے محبت کے باب کو بہت ہی لطیف انداز میں نبھایا ہے۔ اللہ تعالےٰ حضرت قاضی صاحب کو جزائے خیر دے اور ہمیں توفیقِ عمل۔

افسانوں میں سے "جو کبھی نہ مٹ سکے" "آخری سہارا" اور "غیرت کا امتحان" بہت پسند آئے۔ باقی بھی کچھ کم نہ تھے۔

طنز و مزاح میں "مردِ سیاست سے ایک انٹرویو" ممتاز احمد صاحب کی ایک اچھی تخلیق ہے مگر وہ اس میں پوری طرح طنز پیدا نہیں کرسکے۔

"ٹوپی" ایک طنزیہ تجزیہ ایک کامیاب کوشش ہے

"تبرکات" نہایت قیمتی اور انمول موتی ہیں جو ہمارے میگزین کی امتیازی خصوصیت ہے۔

الغرض "المنار" کا جنوری، فروری مارچ ۱۹۶۳ء کا شمارہ مضامین اور ان کی ترتیب اور مواد کے لحاظ سے بلکہ ہر لحاظ سے ایک نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ فقط

حامد۔ ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ایڈیٹر صاحب "المنار"

"المنار" کا گذشتہ شمارہ نظر سے گذرا۔ "المنار" کے مضامین اندازِ فکر اور جاذبیت کے لحاظ سے یقیناً ایک اعلیٰ معیار پر ہیں۔ جناب عطاء المجیب صاحب راشد کا مضمون نہایت ایمان افروز ہے اور مستند مواد کی وجہ سے قابلِ تعریف ہے۔ ہادیٔ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے ہر شمارہ مزین ہونا چاہیئے جو نہ صرف ارتقائے روحانیت بلکہ تکمیل انسانیت کے لئے بھی لابدی ہے۔ افسانوں کا معیار اچھا ہے اور اخلاقی تعمیر میں ممد معاون ہیں۔ مگر طنز و مزاح کے صفحات جاذبیت سے خالی ہیں۔

تعلیمی اصلاحات کے ضمن میں آپ کے رجحاتِ فکر یقیناً پسندانہ ہیں۔ قومی روح اور حب الوطنی کی پوری طرح غمازی کر رہے ہیں۔ روشن خیال اور دور اندیش عوام اور ارباب اقتدار ضروریاتِ امور سے متفق ہونگے اور اسے مشعلِ راہ بنائینگے اس ضمن میں چند باتیں بغرض مزید توضیح عرض خدمت ہیں۔

تعلیمی اصلاحات کی ناکامی کے پسِ پردہ کچھ خود غرض سیاسی لیڈروں اور تخریبی عناصر کا ہاتھ نظر آتا ہے اس لحاظ سے یہ رائے قائم کرلینا کہ طلباء میں قومی روح کا فقدان ہے حقیقت پر

مبنی نہیں کیونکہ تخریبی عناصر نے ان اصلاحات کو ایسا گھناؤنا ظاہر کیا کہ تعلیمی فضا مکدّر ہو گئی اور ایک سخت بحران اور ارتعاش پیدا ہو گیا تخریبی عناصر نے اپنی بندوق طلباء کے کندھے پر رکھکر چلائی ورنہ پاکستانی طلباء کسی دوسری زندہ قوم کے طلباء سے قومی اور وطنی محبت میں کچھ کم نہیں کسی ایک آدھ مثال سے ایسا نظریہ قائم کر لینا مسلمہ حقیقت نہیں کہلا سکتی۔ بعض ضمنی وجوہات کو منظر عام پر لا کر سیاسی لیڈروں نے طلبا کو ضرور متاثر اور برانگیختہ کیا اور وطن عزیز کے امن میں خلل پیدا کیا یہ وجہ کافی متقاضی ہے کہ طلبا کی زجر و توبیخ میں شدت نہ ہو۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے قربانی نام ہے اپنے کچھ جائز حقوق کو ترک کرنا اور اس کے بدلے میں کسی مابعد اجر کی امید رکھنا۔۔۔۔ حقیقت میں یہ معمولی مالی بوجھ (جسے غیر معمولی تصور کیا گیا ہے اور مالی مشکلات سے تعبیر کیا گیا ہے) تعلیمی اصلاحات کے نفاذ میں روک نہ تھا مغربی اقوام میں مالی مشکلات کے نتیجہ میں تعلیم حاصل نہ کرنے کو نہایت قبیح اور مذموم خیال کیا جاتا ہے۔ اقتصادی حالت کا بہتر نہ ہونا تعلیم میں ہرگز مانع نہیں ہے کئی مثالیں ہماری قوم اور ان اقوام میں ایسی پائی جاتی ہیں کہ بعض بڑی بڑی شخصیتوں نے علمی مصروفیات کے بعد فارغ اوقات میں اپنی مالی پوزیشن کو بہتر بنایا اور علم حاصل کرنا اس وجہ سے نہ چھوڑا کہ مالی مشکلات حائل تھیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طلباء اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں عار محسوس نہ کریں اپنے ہاتھ سے کام نہ کرنے کے نتیجہ میں آج ہماری تکنیکی پرواز کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ اور ایسے ادارے یقیناً ناکامی سے ہمکنار ہیں۔

ضرورت آج اس بات کی ہے کہ ہمارے طلبا اپنے اپنے اندر جذبہ قربانی پیدا کریں اور تخریبی عناصر کا شکار نہ ہوں۔ خاکسار نصر اللہ خان ناصر

جامعہ احمدیہ - ربوہ

محترم ایڈیٹر صاحب "المنار" - السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

"المنار" کے قارئین تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں (ضلع سیالکوٹ) کا مختصر سا تعارف کالج کے ایک لیکچرر جناب محمد عثمان صاحب صدیقی ایم۔اے کے مضمون سے حاصل کر چکے ہیں اور کالج ہذا کے پرنسپل جناب چودھری عبدالسلام صاحب اختر ایم۔اے کی غزلیں اور نظمیں بھی معزز قارئین کی نظروں سے گذری ہونگی۔ پھر ملک کے بعض دوسرے اخبارات مثلاً "نوائے وقت" "لاہور" وغیرہ میں بھی اس نو قائم شدہ ادارہ کی تعلیمی و ادبی سرگرمیوں اور ملّی و قومی خدمات کا تذکرہ بعض احباب کے ملاحظہ میں آیا ہوگا۔ احباب جانتے ہیں کہ گذشتہ سال گھٹیالیاں کالج کی گیارھویں جماعت کا نتیجہ سو فیصدی رہا۔ یہ کالج ہذا کی پہلی کلاس کا پہلا نتیجہ تھا جو اس کے روشن مستقبل کی غمازی کرتا ہے اس سال (سنہ ۱۹۶۳ء) میں خدا تعالیٰ کے فضل سے بارھویں جماعت کا اجرا بھی ہو چکا ہے جس کا نتیجہ بھی (انشاء اللہ العزیز) نہایت امید افزا ہوگا۔ قارئین "المنار" اس نوخیز تعلیمی ادارہ کی ترقیات کیلئے دعا فرمائیں۔ والسلام

خاکسار نذیر احمد خادم

سیکرٹری کالج یونین گھٹیالیاں۔

(باقی صفحہ ۱۱۶ پر)

مزاحیہ

یو نائیٹڈ فرنٹ آف فلائیز

کے زیرِ اہتمام

ایک اہم کانفرنس

— رشید جاوید —

نوٹ:- اس مضمون کے تمام کردار اور جگہوں کے نام فرضی ہیں۔ اتفاقی مطابقت کی صورت میں مضمون نگار ذمہ دار نہیں

(۱)

آیئے آپ کو مکھپال سویٹ ہاؤس پر لے چلیں

تھوڑی دیر بعد وہاں مکھیوں کا ایک اہم اجلاس ہونے والا ہے۔ ہاں تو لیجئے یہ رہی مکھپال حلوائی کی دکان۔ ذرا اطمینان سے بیٹھ جایئے — اور اگر کسی صاحب کو کرسی پر ورزش کرنے کی عادت ہو تو براہ کرم ایثار اور ضبط سے کام لے — کرسی ہلانے کے لئے نہیں بلکہ بیٹھنے کے لئے بنائی گئی ہے — اور ہاں ایک اور بات بھی یاد رکھیئے میز پر پڑے ہوئے مٹھائی کے چھوٹے چھوٹے ذرات پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش نہ فرمایئے گا — یہ اجلاس میں شامل ہونے والوں کا حصّہ ہے — دیکھئے تو ذرا مکھپال صاحب نے کس سلیقے سے میز کو رنگا رنگ مٹھائیوں سے سجایا ہوا ہے!! دیکھئے نا ذرا — یہ رہا — بوندی کا دانہ اور ساتھ ہی گلاب جامن کے رس کا قطرہ — اور وہ دوسرے کونہ میں جلیبی کی لسیلی بھی ملاحظہ فرما لیجئے — اور یہ جو درمیان میں کچھ چمک رہا ہے، یہ کیا ہے؟ — ہاں — یاد آیا! یہ تو چاندی کے ورق کا ذرہ ہے — بہت خوب!! — اور صاحب! یہ جو چھوٹے چھوٹے سفید مائل دانے آپ کو نظر آ رہے ہیں یہ شکر پاروں کے نمائندے ہیں — اور یہ رہے قلاقند اور برفی کے ایٹم — یہ تو تھی مٹھائیوں کی مختصر تفصیل — چلئے آپ اسے تقدیر کہہ لیجئے — مگر ع

مٹھائیوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

آپ کے سامنے روپیہ کے سائز کا ایک تالاب بھی نظر آ رہا ہے — غور سے دیکھئے۔ یہ چائے ہے — اور شمالی کونہ پر جو سفید رنگ کی چھپکلی سی نظر آ رہی ہے نا۔ یہ دودھ ہے! — خوب!!! — دعوت کیا ہے — مٹھائیوں اور مشروبات کا معجون ہے — ہا! کیا پُر لطف سماں ہے — بہار کی معطر ہوا سے

بغلگیر ہوتی ہے اور پھر اپنے سفر میں محو ہو جاتی ہے ——— ہمارے بدن انگڑائیاں لے رہے ہیں ——— سستی چھا رہی ہے ——— مکھپال صاحب نے چھت سے بندھے ہوئے باریک ململ کے سفید پردے گرا دیئے ہیں ——— پردے ہماری کرسیوں کے آگے میز کے چاروں طرف محیط ہو گئے ہیں۔ مکھپال صاحب روزانہ بارہ بجے مکھیوں کے لئے ظہرانہ کا اہتمام کرتے ہیں ——— بھیں! بھیں!! بھیں!!! بھیں!!!!" ——— مکھیاں برقی بلب کے لمبے تار سے میز کی طرف لپکنے لگی ہیں ——— سفید پردوں کے اندر کی خفیف سی حرکت بھی نظر آ رہی ہے ——— بعض مکھیوں کے غیر معمولی سُرخ سر اور پروں کے امتیازی رنگ کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی ماڈرن سوسائٹی کی مجلس عاملہ زرق برق گاؤنوں میں ملبوس ہے۔ دیکھئے اب بالکل خاموش ہو جایئے ——— مکھیاں ظہرانہ سے فارغ ہو رہی ہیں اور اجلاس عنقریب شروع ہونے والا ہے ——— ایک بڑے سے قد والی مکھی میز کے جنوبی طرف عین وسط میں پہنچ چکی ہے ——— چند اور ممتاز مکھیاں اسکے دائیں بائیں ایک ترتیب سے بیٹھ چکی ہیں ——— عام مکھیوں نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لی ہیں ——— درونِ پردہ مکمل سکوت طاری ہو چکا ہے ——— مکھیاں اپنے لیڈروں کی طرف منہ کر کے پیکرِ توجہ بنی بیٹھی ہیں ——— ہمہ تن گوش اور بالکل خاموش ——— کوئی اہم مسئلہ پیش ہونے والا ہے۔ صاحبہ صدر اپنا سر اٹھاتی ہیں ——— ایوان میں تالیوں اور آوازوں کا شور ——— ہیئر ہیئر ——— منلالا ———

منلالا کی جے! ——— منلالا زندہ باد! ——— صدارتی ارشادات ——— "مکھیو! خَا سَرَ اللّٰہ عَذْ وَکُفر خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں مل بیٹھنے کا موقع عطا فرمایا اور باہم مشترکہ مفاد پر غور و فکر کی توفیق دی ہے ——— بیشتر اس کے کہ میں آج کے اجلاس کی غرض و غایت بیان کروں۔ میں مناسب خیال کرتی ہوں کہ حاضرین سے اپنی عاملہ کا تعارف کرا دوں۔ میرے دائیں طرف محترمہ ھَشفلا صاحبہ ہیں اور ملک کے مشرقی حصہ سے نمائندگی کر رہی ہیں ——— ان کے دائیں طرف محترمہ مِانیا زَج صاحبہ ہیں اور ملک کے مغربی بازو کے جنوبی حصہ کی نمائندہ ہیں ——— میرے بائیں جانب ڈقزگ صاحبہ تشریف فرما ہیں۔ آپ غربی بازو کے شمال مشرقی علاقہ کی نیابت فرما رہی ہیں۔ ان کے آگے فُرننگ صاحبہ ہیں ——— آپ آج کے اجلاس کی سیکرٹری اور ملک کے پورے غربی ریجن کی نمائندہ ہیں ——— علاوہ ازیں بین الملل کانفرنسوں میں تمام مکھیوں کی نمائندگی کرتی ہیں ——— حالیہ چھپر مکھستان "سرطانتی کانفرنس" میں مکھیوں کی طرف سے آپ ہی شامل ہوئی تھیں ——— خدماتِ جلیلہ کے صلہ میں قوم سے دو امتیازی تمغے بھی حاصل کر چکی ہیں ——— یعنی سکنگش پیشل اور شُرّ رُو پیشل ——— محترمہ صدر صاحبہ کی گردن نیچے کی طرف جاتی ہے ——— صدرِ گرامی پھر مخاطب ہیں ——— اب میں آپ کے سامنے آج کے اجلاس کی غرض و غایت رکھتی ہوں۔ اس اجلاس کا مقصد ملک کے وزیرِ صحت کے نام ایک عرضداشت کے مسودہ کا پاس

کرنا ہے — قرارداد کا متن تیار کر لیا گیا ہے —
محترمہ قُرتنتانہ صاحبہ آپ کے سامنے یہ قرارداد
رکھیں گی" — محترمہ قُرتنتانہ صاحبہ! — دُبلے
پتلے قد کی، تیز طرار مکھی، امتیازی تمغوں سے سجی ہوئی
آگے بڑھتی ہے — "معزز بہنو! کامیابی تمہارے
قدم چومے — جو قرارداد مجلس عاملہ نے منظور کی
ہے وہ میں آپ کے سامنے پڑھ کر سنا دیتی ہوں" —
قرارداد شروع ہوتی ہے —

"مکھیال سویٹ ہاؤس، فلائزول [1]

۱۲ مارچ ۶۳ء

بخدمت فضیلت مآب وزیرِ صحت! دام اقبالہ

آپ کے ملک کی ایک پُرامن اور وفادار رعایا ہونے
کی حیثیت سے ہم مکھیاں آپ کی توجہ اس ظلم و ستم کی
طرف مبذول کرانا چاہتی ہیں جو بیسویں صدی کے آغاز
سے ہی انسانوں کی طرف سے ہم پر روا رکھا جا رہا ہے
آج تک دنیا میں کسی جاندار کا اتنا کشت و خون نہیں
ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ یہ قتل و غارت زمانۂ حال
کا سب سے بڑا المیہ اور سب سے خطرناک فتنہ ہے ؎

وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار

مگر بیسویں صدی جوں جوں پیرانہ سالی کی طرف بڑھ
رہی ہے اس کا جور و ستم برابر ترقی کر رہا ہے نہ معلوم
بیسویں صدی کی پرہیزگاری کا آغاز کب ہوگا —
مکھیوں کی تاریخ کا یہ دردناک باب نہ جانے کب
ایک نئے اور سنہری باب کے آغاز کا موجب ہوگا" —
سب سے زیادہ صابر اور متحمل مزاج قُرتنتانہ صاحبہ

کی ہچکی بندھ جاتی ہے — آواز بھرانے لگتی ہے —
اس وقت تمام ایوان مجسّم رقت نظر آ رہا ہے —
آہ و بکا، چیخیں اور پکاریں — سوز و گداز کا ایک
عالم روپ دھار رہا ہے — قُرتنتانہ صاحبہ
قدرے سنبھلتی ہیں — "بہنو! تسلی رکھو۔ انصاف
اور داد رسی کا وقت جلد آیا چاہتا ہے صبر اور ہمت
سے کام لو — ثمر شیریں تمہارے انتظار میں ہے
— ہاں! تو میں قرارداد کے اس حصہ تک پہنچی تھی
کہ — "مکھیوں کی دردناک تاریخ کا باب نہ جانے
کب ایک نئے اور سنہری باب کے آغاز کا موجب
ہوگا" — اب بقیہ قرارداد سنیے — "عزت مآب
وزیرِ صحت! یہاں ہم آپ کی توجہ ان ہتھکنڈوں کی
طرف مبذول کراتی ہیں جو انسان ہمارے خلاف
وقتاً فوقتاً استعمال کرتا رہتا ہے — آہ! ان ہتھکنڈوں
کا تصور ہمارے لئے کس قدر جانکاہ ہے۔ دل منہ
کو آتا ہے اور رُوح تڑپنے لگتی ہے — ڈی۔ڈی۔ٹی
— انسان کا سب سے بڑا کامیاب حربہ اور خطرناک
ہتھکنڈہ ہے۔ اس وقت تک کروڑوں کروڑ اجتماعوں
کو اس خوفناک بم سے اڑایا جا چکا ہے جب کسی اہم
مشورہ کے لئے ہم اکٹھی ہوتی ہیں۔ انسان شوں شوں
کرتا ہوا ہم پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں
ایک سانپ ہوتا ہے جس کے منہ سے زہر کی بارش
ہوتی ہے۔ آن کی آن میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے
ہیں — کس قدر تکلیف دہ اور رُوح فرسا ہوتا ہے
یہ منظر — اور صاحب! آپ کو اس وقت تھوڑا احساس

[1] [illegible]

بھرنے یا جمائیاں لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ "دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے" لہٰذا ہمدردی کچھ وقت کے لئے ریزرو (Reserve) رکھیئے ۔۔۔ فرتنات صاحبہ کاغذ الٹ کر عرضداشت جاری رکھتی ہیں ۔۔۔ "فضیلت مآب! دوسرا حربہ جو انسان ہمارے خلاف استعمال کرتا ہے وہ ایک قسم کا ریکٹ (Rackett) ہے ۔۔۔ ابتداءً جب یہ جالی دار چھڑیاں ہم نے دیکھیں تو ہمیں خیال آیا شاید درونِ خانہ کسی کھیل کے لئے ایجاد کی گئی ہیں ۔۔۔ وائے بدقسمتی ۔۔۔ کیا معلوم تھا کہ کھیل تو ہم پر ہی کھیلا جانیوالا ہے۔ بیوی ہے تو اس کے ہاتھ میں چھڑی ہے۔ بچہ ہے تو اس کے ہاتھ میں چھڑی ہے باپ کی تو خیر بات ہی کیا ۔۔۔ سپیشل آفیسر آن ڈیوٹی ہے ۔۔۔ سونے سے قبل سب گھر والوں سے دن بھر کی کارگزاری کی رپورٹ لیتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے مناسب ہدایات سے "لیس" کرتا ہے۔ روزانہ لاکھوں کروڑوں مکھیاں اس "مکھی مار چھڑی" کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں ۔۔۔ سر منڈاتے ہی کتنی بار اولے پڑے، صحیح تعداد میں نہیں بتایا جا سکتا ۔۔۔ اور حضور! کیا کیا بتائیں ہمارے ساتھ تو پوری گوریلا جنگ لڑی جاتی ہے۔ جو لوگ ذرا ماڈرن نہیں ہیں۔ وہ کرتے سیدھ کر کے پنکھوں اور تولیوں سے وہ گت بناتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی ۔۔۔ اور پھر حضور! انسان کا غصہ یہاں ہی ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔ وہ ہمیں کوسنے لگتا ہے ۔۔۔ طعنے دیتا ہے ۔۔۔ "اب پتہ چلا ہے! کس طرح رینگ رینگ کر فرش پہ چل رہی ہو۔ کمبختو! تمہارا علاج ہی یہی ہے!" ۔۔۔ لاحول ولا قوۃ ۔۔۔

اور سنیئے حضور! ان دنوں علم معاشیات بھی انسانی دماغوں پہ کافی چھا چکا ہے۔ حال ہی میں انسان کو ایک تجارتی ہتھکنڈہ بھی سوجھا ہے جس کا مقصد ہمارے خلاف جارحانہ عزائم کو تقویت پہنچانا اور اینٹی فلائز (Anti Flies) تحریک کو مزید ہوا دینا ہے۔ کل ہی مکھپال صاحب کی میز پہ پڑے ہوئے اخبار میں ہم نے جب یہ خبر پڑھی کہ "جو کوئی ایک سیر مکھیاں "قتل" کر کے لائے گا اسے آٹھ آنے انعام دیا جائے گا۔ تو زمین ہمارے پاؤں تلے سے نکلتی لگی ۔۔۔ خدا رحم کرے ۔۔۔ پہلے تو "مکھیاں مارنے" کا محاورہ رائج تھا جو کہ کاہلی اور سستی پہ دلالت کرتا ہے۔ اب انسان نے قدیم محاورہ سے ذرا ہٹ کر ایک باوقار جدید محاورہ تراش لیا ہے۔ یعنی "مکھیوں کے قتل" کا تجارتی محاورہ ۔۔۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام ۔۔۔ قتل بھی کرو اور انعام بھی پاؤ ۔۔۔ مگر حضور! یہ ستم بالائے ستم بھی تو ہے ۔۔۔ قتل کی سزا قتل ہے نہ کہ انعام ۔۔۔ ہمارے ملک کا آئین تمام رعایا کی جان کی حفاظت کا ضامن ہے اور اصول کے مطابق قاتل ہمیشہ عدالتوں میں تختۂ دار پر لٹکایا جاتا ہے ۔۔۔ مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے ۔۔۔ کبھی نہیں سنا گیا کہ کسی مہذب ملک میں "پرامن رعایا" کو منڈی میں فروخت کیا جاتا ہو۔ آخر ہم نے کونسا گناہ کیا ہے۔ انسان سے بڑھ کر کس چیرہ دستی

کا ترکیب ہوئی ہیں کہ ہم "ہیں اور خشک میوہ" میں امتیاز کرنا بھی محال ہو گیا ہے۔ پالتو مرغوں، کبوتروں اور تیتر بٹیروں کے لئے "خشک میوہ" بازار سے مقابلتاً سستا حاصل کریں۔ — مکھیاں — ۵ نئے پیسے فی چھٹانک — یہ ہے ایک دکان کا وہ سائن بورڈ جس کی اطلاع محترمہ جنابہ ارجمند صاحبہ نمائندہ علاقہ جنوبی نے دی ہے — یہ دن بھی قسمت نے دیکھنے تھے — بہر حال حضور! ان گنت حربے ہیں اور بے شمار ہتھکنڈے۔ کیا بتائیں اور کیا نہ بتائیں —

گذارش صرف اس قدر ہے کہ ملک میں ہمارے بنیادی حقوق بحال کئے جائیں اور ہمارے بے محابا قتل کو روک کر آئین کی روح کا احترام کیا جائے — اگر ہمارے قتل کو نہ روکا گیا۔ تو ایک دن آئے گا کہ انسان اس قدر پتھر دل ہو جائے گا کہ باہم کشت و خون سے بھی گریز نہیں کرے گا اور وحشیوں کی طرح اپنی ہی نسل کو قتل کرتا پھرے گا۔ مستقبل ہماری اس فلسفیانہ بات کا ثبوت مہیا کریگا۔ پھر حضور! اس "خیر اندیشی" نصل کے علاوہ انسان کو یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ خدا نے ہر چیز کی پیدائش میں بعض خاص حکمتیں رکھی ہیں۔ ہماری پیدائش میں بھی اللہ تعالے نے کئی حکمتیں رکھی ہیں انسان کو کم از کم ان حکمتوں کا ہی احترام کرنا چاہیئے منجملہ ان حکمتوں کے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کی عاجزی ثابت کی جائے۔ اور حضور! عاجزی کے لفظ سے انسان کو ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خدا کے علاوہ کسی اور کے اندر عاجزی کا پایا جانا کوئی بری بات نہیں۔ کھلی فضا میں جب ہم چاروں طرف سے انسان کا محاصرہ کر لیتی ہیں تو وہ کس قدر بے بس ہوتا ہے ہمیں باز رکھنے کے لئے اس کی ہر کوشش ناکام رہتی ہے۔ مگر اس بے بسی اور ناکامی کے اندر اس کے لئے ایک بہت بڑا سبق پنہاں ہے اسے خدا کی بڑائی اور عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ غرور اور تکبر ایسی تباہ کن سوء خلق سے بچ سکتا ہے — اور کون نہیں جانتا کہ ؎

"تکبر عزازیل را خوار کرد"

پس ہمیں تو انسان کے اندر فروتنی اور خاکساری پیدا کرنے کے لئے آلۂ کار بنایا گیا ہے۔ خدا تعالے نے ہمیں پیدا کر کے انسان کو بتایا ہے کہ تم اپنے آپ کو کچھ سمجھ نہ لینا۔ یہ حقیر سی مخلوق تمہارے ناک میں دم کر چھوڑے گی — پھر منجملہ ان حکمتوں کے دوسری حکمت ہماری پیدائش میں یہ ہے کہ جب انسان جس میں اختراع کا مادہ بدرجۂ اتم رکھا گیا ہے ایسی ایسی ایجادیں کرے گا کہ لوگوں کی عقلیں دنگ رہ جائیں گی تو اس وقت بھی انسان پر خدا کا یہ چیلنج "قائم رہیگا کہ اے اترانے والے انسان! اے میرے ناشکرگذار! اگر تو اپنی عقل ہی کو سب کچھ سمجھے بیٹھا ہے تو اس مکھی کی ایک "ٹانگ" تو ذرا بنا کر دکھا دے۔ لیکن انسان ایسا نہیں کر سکے گا۔ اور اسے خدا کی نعمتوں کا اقرار کرنا پڑے گا۔ پس ہمارے وجود کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ انسان کے اندر شکرگذاری کا مادہ پیدا ہو پھر ایک تیسری حکمت ہمیں پیدا کرنے میں یہ تھی کہ انسان کو صفائی کا سبق دیا جائے۔ غسل کے متعلق

تو ہمیں یقین ہے کہ یہ انسان نے ہم سے براہِ راست سیکھا ہے۔ اگر انسان ہماری حرکات پر غور کرے تو وہ دیکھے گا کہ عموماً ہر دو منٹ کے بعد ہم اپنے تمام جسم کو صاف کرتی ہیں۔ پھر خوراک کھانے کے بعد ہم اپنے ہاتھ پاؤں منہ اور پَر فوراً غلاظت سے پاک کرتی ہیں۔ پس ہمارا وجود بڑا مبارک وجود ہے۔ انسان ہم سے صاف رہنے کا سبق بدرجہ اتم سیکھ سکتا ہے۔ سوچنا چاہیئے کہ انسان ہمیں اپنا دوست رکھے نہ کہ دشمن — وہ ہمارے بہت سے فوائد سے صرف اسی صورت میں فائدہ اُٹھا سکتا ہے کہ ہمیں مارنے کی بجائے ہماری حفاظت کرے اور ہم سے وسیع پیمانے پر فائدہ حاصل کرنے کے لئے ہماری افزائش نسل کا اہتمام کرے۔

اب ہم یہ عرضداشت اس گذارش کے ساتھ ختم کرتی ہیں کہ ملک بھر میں مکھیوں کے قتلِ عام کو فوراً روک دیا جائے اور ہمارے قتل کو غیر قانونی قرار دے کر خلاف ورزی کرنے والوں سے سخت ایکشن لیا جائے

ہم ہیں — ممبرات ایگزیکٹو کمیٹی

یو۔ ایف۔ ایف (U.F.F)

فُوتنگ صاحبہ عرضداشت ختم کر کے اپنی جگہ واپس آ رہی ہیں — محترمہ صدر صاحبہ کچھ فرمانا چاہتی ہیں — سنیئے — "میں تمام مکھیوں کی ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر مجلس کی رونق کو دوبالا کیا — اب میں آپ کی رائے لینا چاہتی ہوں کیا آپ سب کو اس قرارداد سے اتفاق ہے؟" — "ہوں اوں — ہوں اوں! ہوں اوں" — سب مکھیوں نے قرار کو متفقہ طور پر منظور کر لیا ہے — صاحب صدر کا ایک اعلان سنیئے — "محترمہ ھَضْفَلاَ صاحبہ آج یہ قرارداد وزیر صحت کے پاس لے جائیں گی انہوں نے جو جواب دیا۔ وہ کل کے اجلاس میں آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ کل کا اجلاس ٹھیک بارہ بجے اسی جگہ شروع ہوگا۔ ہمیں وقت کی پابندی کا خیال رکھیں۔ اب میٹنگ برخاست کی جاتی ہے خدا حافظ!"

۲

سب مکھیاں شاداں و فرحاں بینڈ بجاتی اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف جا رہی ہیں ھَضْفَلاَ صدرِ مجلس ھتلا لا سے ضروری ہدایات لے رہی ہے — اب وہ اڑنے کے لئے پَر تول رہی ہے — لیجیئے وہ وزیر صحت کے نام عرضداشت لے کر روانہ ہو گئی۔ آیئے اب ذرا گھر چلیں کل پھر مکھیپال صاحب کی دوکان پر چائے پینے آئیں گے — آیئے چلیں — سورج ڈھل رہا ہے — افق کے قریب بکھرے ہوئے بادل یوں دکھائی دے رہے ہیں جیسے سُرخ رُوئی کے گالے ہوں — شام کے سات بجنے کو ہیں — لوگ سونے کی تیاریوں میں مشغول ہیں — آسمان پر تارے جھلملانے لگے ہیں — چاند کی روشنی بہت پیاری اور بھلی معلوم ہو رہی ہے — فضائے بسیط پر مکمل سکوت طاری ہو چکا ہے — لیجیئے مرغ نے پہلی اذان دے دی ہے — افق پر سفید اور سیاہ دھاگے میں کشمکش جاری ہے — اور اب —

مؤذن حقوق اللہ کی ادائیگی کے لیئے ہم سب کو بلا رہا ہے — سحر کے سہانے سماں میں اذان کے الفاظ ایک وجد کی کیفیت طاری کر رہے ہیں — صبح کے چھ بج رہے ہیں — اب سے پورے چھ گھنٹے بعد ہم مکھیاں صاحب کے سویٹ ہاؤس پر جمع ہونے والے ہیں — ۷ — ۸ — ۹ — ۱۰ — ۱۱ — صرف ایک گھنٹہ اجلاس شروع ہونے میں باقی ہے۔ ہم وزیر صحت کا جواب سننے کے لئے اپنے کل والے مقام کی طرف جا رہے ہیں — ۱۱-۵۵ — ہم سب ساتھی کرسیوں پر بیٹھ چکے ہیں — سفید پردے گرتے ہیں — مکھیاں حسب معمول ٹھرا نہ کھانے میں مشغول ہیں — بارہ بج رہے ہیں — مکھیوں کا اجلاس شروع ہوتا ہے — وہی کل والی ترتیب ہے — صاحب صدر مِس لا لاھَضْفَلا سے وزیر صحت کا جواب پڑھنے کے لئے کہہ رہی ہیں — ھَضْفَلا جواب پڑھنے کے لئے آگے بڑھتی ہے — "بہنو! اللہ تعالٰی ہمیں صبر کی نعمت سے مالا مال کرے — وزیر صحت نے جو جواب آپ کی عرضداشت کا دیا ہے — وہ میں آپ کو پڑھ کر سنا دیتی ہوں" —

اس وقت آپ وزیر صحت کا جواب سن رہے ہیں —

"سادہ لوح مکھیو! اگر تم درست رستہ پر ہو تو خدا تم پر سلامتی نازل کرے۔ قطع نظر اس تکلیف کے جو ھَضْفَلا کی موجودگی میں میں نے محسوس کی میں تمہاری عرضداشت کا براہِ راست تجزیہ کرتا ہوں۔ سب سے پہلے میں یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ تم ہماری حکومت کے زیر سایہ ایک "وفادار" اور "امن پسند" رعایا ہو۔

میں نے جب تمہارے ان الفاظ پر غور کیا۔ تو تمہاری "وفاداری" کا سراغ مجھے کوفہ اور عراق کی سرزمین میں ملا۔ تمہاری امن پسندی کے "نشانات" میں نے "ہلاکو خاں" کی شخصیت میں پائے۔ نہ معلوم تم آئین کی یہ شق کیوں بھول گئیں کہ کسی کو ناحق نہیں ستایا جائے گا۔ جب تم ناحق ستانے پر تل گئیں تو تمہیں اس بات کا اعتراف بھی ہے تو نہ تم "وفادار" ٹھہریں۔ کیونکہ آئین کی خلاف ورزی کی اور اس کی روح کو نقصان پہنچایا اور نہ تم "امن پسند" ٹھہریں۔ کیونکہ یہ چیز تمہاری سرشت میں داخل ہی نہیں کی گئی۔ تمہارا مقصد حیات ہی تمام جانداروں کو ستانا اور دق کرنا ہے تباؤ میں تمہاری باتوں کو کیا وزن دوں۔ جبکہ تمہاری نمائندہ مکھی ہی تمہارے دعووں کی تغلیط کر رہی ہو ھَضْفَلا نے آتے ہی میرے کان پر کاٹا جبکہ میں ایک ضروری کاغذ پہ دستخط کر رہا تھا۔ ان کو مشکوک کر دیا۔ اور جب تک یہ میرے کمرے میں رہی میرا سکون اور آرام اس کے کاٹنوں اور اس کی شرارتوں کی نذر رہا۔ تم تو "سکون کش" ہو۔ تمہیں "امن پسند" کون کہتا ہے!!

پھر اپنی نام نہاد عرضداشت میں تم نے کئی دفعہ انسان کو ظالم، جابر اور ستمگر ٹھہرایا ہے لیکن شاید تم بھول گئیں۔ جس طرح کہ سب ہی ایسے موقعوں پر بھول جاتے ہیں۔ کہ ظلم کا آغاز اور اس کی ابتداء خود تمہاری طرف سے ہوئی۔ اگر تم شریف اور امن پسند ہوتیں تو انسان کبھی تمہارے خلاف منصوبے نہ سوچتا۔

آخر اس نے بھینسوں، بھیڑوں اور بکریوں کے خلاف منصوبے کیوں نہ سوچے۔ صرف تجھ رتی بھر کے لئے اس کیوں اپنے فکری قوتی کو اتنی تکلیف دی۔ اس لئے کہ تو ظالم ہے۔ تجھے ستانے میں مزا آتا ہے۔ پس انسان کو بھی اپنے دشمن کو "قتل" کرنے میں مزا آتا ہے۔ تمہارا حملہ جارحانہ ہے انسان کا جواب مدافعانہ ہے۔

مجھے حیرانگی ہے کہ تم نے اخبار میں یہ خبر تو پڑھ لی کہ مکھیوں کو قتل کرنے والوں کو انعام دیا جائے گا لیکن تمہاری نظروں سے اس قسم کی خبریں کیوں اوجھل رہیں۔ مثلاً منصور ۱۰ ارمارچ۔ حلقہ مری گیٹ کے شہریوں نے کمیٹی سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کے حلقہ میں مکھیوں کے انسداد کا انتظام کرے۔ یاد رہے کہ گذشتہ پندرہ روز سے مکھیوں نے "مان نہ مان میں تیرا مہمان" کے فارمولا پر عمل کر کے شہر کے اس علاقہ پر دھاوا بول دیا ہے۔ اس بن بلائے مہمان نے لوگوں کے سکون اور آرام کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے زیادہ نقصان طلبہ کو پہنچا ہے مکھیاں اس بات پر مُصر ہیں کہ طلبہ ان کی داستانیں سُنیں اور ان کے کھیل دیکھیں ـــــ بعض عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ مکھیوں نے دکاندار طبقہ کے ناک میں بھی خوب دم کر رکھا ہے۔ اور مکھیوں کی فوج ظفر موج ہر آن ان سے اپنا راشن طلب کر رہی ہے کریانہ سٹوروں میں کھانڈ وغیرہ کی بوریوں پر ان کے مورچوں کو خاصہ مضبوط بنایا گیا ہے۔ شہر کے دوسرے حصوں سے بھی اس انوکھی "چھاتہ فوج" کے حملوں کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ بتاؤ تم "دفادار" رعایا ہو یا "غدار"، "امن پسند" رعایا ہو یا "شر پسند"۔ اپنے دامن میں مُنہ ڈال کر خود ہی سوچ لو۔

یہاں تک تو تمہاری نام نہاد "آئینی بحث" کا جواب آ چکا۔ اب میں تمہاری پیدائش کے پہلو کو لیتا ہوں جو کچھ تم نے اپنی پیدائش کے سلسلہ میں بیان کیا ہے اور جو فوائد کی گردان تم نے کی ہے میں جزوی طور پر اس سے متفق ہوں البتہ تمہارا یہ کہنا کہ یہ مبینہ فوائد صرف تمہارے وجود اور بقاء سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ میری سمجھ سے کچھ بالا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر تم میں عقل ہوتی تو تم ہرگز ایسی بے پر کی نہ اڑاتیں ـــــ انسان کی عاجزی اور خدا کی قدرت اور غلبہ تو اس میں ہے کہ انسان دن رات تمہارا قتل عام کرے اور تم پھر بھی ختم نہ ہو۔ خدا انسان میں کوشش اور سعی کے بعد عاجزی دیکھنا چاہتا ہے۔ محض ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کا نام عاجزی نہیں ہے۔ دیکھو! انسان اپنے تمام وسائل سے کام لیتا رہتا ہے۔ اور ہر وقت جیسے ہتھکنڈے سوچتا رہتا ہے تمہاری کروڑوں کروڑ کھیپوں کو ٹھکانے لگا یا جا چکا ہے لیکن انسان اب بھی اپنی عاجزی کا معترف ہے۔ اسی لئے تو وہ ہموارہ نئے طریقوں کو اختیار کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے؟ مت بھولو کہ تمہیں صفحہ ہستی سے تمام و کمال نہیں مٹا یا جا سکتا۔ پس تمہارا وجود انسان کے لئے اس حال میں تو ضرور فائدہ مند رہیگا کہ تم خال خال رہ جاؤ اور کبھی کبھار اپنی طاقت کا

اظہار بھی کر لیا کرو۔ لیکن تمہاری بڑھتی ہوئی آبادی کو انسان کسی بھی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔

پھر تم نے جو صفائی پسندی کا ڈھونگ رچایا ہے۔ وہ بھی خوب ہے تم جب کو صفائی پسندی سے منسوب کرتی ہو۔ ہمارے خیال میں وہ اعلیٰ درجہ کی غلاظت پسندی ہے۔ پہلے تو تمہارے پاؤں یا منہ پر غلاظت لگتی ہے اور پھر تم ہر دو منٹ کے بعد اس غلاظت کو اپنے تمام جسم پر مل لیتی ہو تاکہ تمہارے جسم کا کوئی حصّہ بھی "امن پسند" نہ رہے۔ کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے

ع فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست

دیانتداری سے بتاؤ۔ ہیضہ، دق، ملیریا اور جیسی مہلک بیماریاں تمہیں سے پھیلتی ہیں یا کسی اور سے۔ تمہارا جسم ہر وقت مختلف الانواع جراثیم سے ملوّث رہتا ہے۔ تم ایک لمحہ کے لیے بھی یہ ثابت نہیں کر سکتیں کہ تمہارا جسم ہر قسم کی غلاظتوں اور نقصان رساں مادوں سے پاک ہے۔ پس ان حالات میں تم ہی بتاؤ تمہارے ساتھ کیا انصاف کیا جا سکتا ہے۔ مجھے تو تمہاری یہ عرضداشت محض "باسی کڑھی میں اُبال" نظر آتی ہے۔ میں تمہارے معاملے میں بے بس ہوں۔ بہتر ہے تم خود ہی اپنے طریقِ عمل کو سنوار لو۔

بالآخر میں پھر اپنا آغازِ کلام کا جملہ دہراتا ہوں ــــ "اگر تم درست رستہ پر ہو تو خدا تم پر سلامتی نازل کرے۔"

ھَشْقَسلا وزیر صحت کا جواب ختم کر کے اپنی جگہ پر واپس جا رہی ہے ــــ صدر مجلس مَشْلا لا صدارتی بیچارگی کے لئے تیار ہو رہی ہیں ــــ دو آدمی مکھیال سویٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہیں ــــ وہ مکھیال سے مخاطب ہیں ــــ "مکھیال! سُنا ہے تمہاری دکان میں مکھیاں روزانہ محفل جماتی ہیں ــــ ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین کی طرف سے ہمیں حکم ہوا ہے کہ مکھیوں کے اس اڈّہ کو فوراً ختم کیا جائے" ــــ آدمی پردے اٹھاتے ہیں ــــ ایک ہاتھ میں مکھیوں کا "مزعومہ سانپ" ہے ــــ شوں! شوں! شوں! شوں! ــــ تمام میز مکھیوں کی لاشوں سے اٹا پڑا ہے ــــ یوں معلوم ہوتا ہے میز پر سیاہ وارنش کر دی گئی ہے ــــ آئیے ارشد صاحب ــــ اور آپ بھی اصغر صاحب ــــ آئیے چلیں۔ ــــ "سچ ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی" (۲۳،۲۲ اپریل سنہ ۱۹۷۲ء)

ـــــ ؛ ـــــ

میری پسند

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے (حفیظؔ)

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے (حالیؔ)

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں (غالبؔ)

مثلِ آئینہ باصفا ہیں ہم
دیکھنے ہی کے آشنا ہیں ہم (جراتؔ)

(مرسلہ مسعود اخترؔ)

ل - م

طنز و مزاح

"ضرورت ہے!"

(معاشرے سے معذرت کے ساتھ)

ایک صاحب کیلئے مبلغ ایک عدد سالم خاتون کی ضرورت ہے۔ چونکہ بدقسمتی سے محترمہ ساری عمر کے لئے درکار ہیں۔ اسلئے احتیاط ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمپنی کو اس "پلان" کے لئے "ٹنڈر" مطلوب ہیں۔ "امیدوار" کی تعلیمی قابلیت، سندات کی نقول، انٹرویو، تنخواہ اور دیگر مراعات ــــ کی تفاصیل پیش کرنے سے قبل نوجوان موصوف کے کوائف پر روشنی ڈالنا ضروری ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ روشنی ڈالنے کے لئے ایک آدھ بلب سے کام نہیں چل سکتا۔ یہاں تو چراغاں بھی ناکافی ہے پھر واپڈا کی بجلی کا کس کو اعتبار؟ آنکھ مچولی ہوتی رہتی ہے۔ اگر بجلی نہ بجھے تو کچھ عرض ہے ــــ یہ کہ آپ جانتے ہی ہیں دنیا نے بڑے بڑے انسان پیدا کئے۔ کبھی تو سمندر کو بھی کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ اگر یہ صاحب بحر بیکراں ہوتے تو ہم اپنی مسکینی کے باوجود انہیں کوزے میں بند کرنے کی کوشش کرتے مگر مسئلہ یہ ہے کہ موصوف بحر بیکراں نہیں بلکہ فقط ایک بحیرہ ہیں۔ اب انہیں کیتلی کے سوا کس چیز میں بند کیا جا سکتا ہے؟ لیجئے اب ہم اس کیتلی کو انڈیلتے ہیں ــــ ملاحظہ کیجئے :۔

ان صاحب کا طول سات فٹ اور عرض بمشکل سات انچ ہوگا۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض نامعلوم وجوہ کی بناء پر موصوف نے شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً پھیلنا پسند نہیں کیا ــ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے مجنوں مرحوم پر کاربن پیپر رکھکر انہیں نہایت صفائی سے "ٹریس" کر لیا ہے۔ اگر یہ بات نہیں تو پھر آرٹ والے چغتائی صاحب کی مہربانی ہے!! ؏

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"!!

چونکہ یہ صاحب "سرو قد" واقع ہوئے ہیں اور پھر مشرقی محبوب کی طرح "کمر" بہت نازک ہے ــــ ان کی کمر پر کسی شاعر نے مائیکروسکوپ "فوکس" کر کے یہ شعر کہا ہے ؎

صنم کہتے ہیں تیرے بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے!

بہرحال ان کی کمر ہے۔ ضرور ہے۔ اور اس میں کچھ خم بھی ہے مگر قربان جائیے کہ یہ خم "زلف ایاز" کے خم سے کم نہیں۔ کچھ عرصے سے ان کے دشمنوں کے علاوہ دوستوں کی طبیعت بھی خراب ہے اسی بیماری کی وجہ سے ان کی گردن بھی "صراحی دار" ہو گئی ہے۔ بلکہ "ریٹائرٹ نما" ہو گئی ــــ اسے کہتے ہیں ؏ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد"۔ بیماری آئی اور انہیں اور زیادہ حسین اور قابل شادی بنا گئی"۔

یہ صاحب عرصہ دراز سے کالج لائف بیتے البتہ ہیں۔ درحقیقت وہ "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" کے بہت زیادہ قائل ہیں۔ کالج لائف سے ان کی شیفتگی اور وابستگی کا مقصد ڈگریاں حاصل کرنا نہیں کیونکہ یہ

ایک گھٹیا مادی مقصد ہے وہ تو کالج لائف کو ENJOY کرنا چاہتے ہیں۔

ان صاحب نے کئی امتحان بھی دیئے ہیں مگر "دلی راولی مے شناسد" ہر بار جناب ذوق خواب ہیں اگر یہ "بشارت" دے جاتے ہیں۔ ع

"گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں"

اور وہ اس پر نازاں ہیں کہ ان کی خوابیں سچی نکلتی ہیں۔ اور غوث یا قطب بننے کے امکانات روشن ہیں!! ہر دست ان کے پاس کوئی سند نہیں لیکن ہاتھ کی صفائی ملاحظہ کیجئے۔ فرسٹ کلاس میٹرک کا سرٹیفکیٹ ان کے پاس موجود ہے جسے وہ محبوب کے پورٹریٹ کارڈ یا ٹیلی گرام کی طرح نہایت ہی عزیز رکھتے ہیں اس سند کو انہوں نے تمباکو والوں کے لائسنس کی طرح فریم بھی کرا رکھا ہے۔ اس زمانے میں ایک خاص قسم کے سرٹیفکیٹ کا رواج چل پڑا ہے۔ اسے کہتے ہیں "کیریکٹر سرٹیفکیٹ"! سنا ہے کہ ان کے کیریکٹر سرٹیفکیٹس کا پلندہ پولیس سٹیشن میں موجود ہے اس کے علاوہ ضلع کے تمام تھانوں میں ان کے پاسپورٹ سائز کی ایک ایک تصویر بھی موجود ہے۔ کیا کہنے اس مقبولیت کے!! موصوف کلاس ٹو "یعنی بستہ ب" سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک قدیم گزیٹڈ پوسٹ ہے۔ تھانے سے انکی دلچسپی دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ ع

"قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا"

مگر اس کے باوجود ہر دم یہی خطرہ ہے کہ یہ صاحب کہیں مستقل طور پر تھانے نہ چلے جائیں۔

جہاں تک حسب نسب کا تعلق ہے اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ صاحب ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ بلکہ ٹیبل لیمپ ہیں، موصوف حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی شرافت کو استعمال نہیں کرتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری شرافت خرچ ہو جائے کچھ تو آڑے وقت کیلئے بچا کر رکھنا چاہیئے!!

یہ صاحب زندگی کی اعلیٰ قدروں سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ذوقِ حسن ہی کا اندازہ کیجئے ان کے کمرے میں طرح طرح کے کریم۔ آئل۔ پاؤڈر، عطر۔ ٹرانسپیرنٹ سوپ.... نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔ موصوف آئینے کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں ــــ ایک شاعر نے کسی کے متعلق کہا ہے ؎

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

مگر خاطر جمع رکھیئے ملکہ تفریق ہی کر لیجئے مجال ہے کہ شرما جائیں چمٹی سے ایک ایک بال اٹھا کر بنا بنا کر سنوارتے ہیں!! ان صاحب کو ملیریا کا عارضہ بھی ہے! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آجکل اپنے وجود باوجود کو فلما رہے ہیں۔ یعنی انہیں "ہیرو" بننے کا عارضہ ہو گیا ہے دق اور سل کے مریض کا پارٹ تو مجنوں مرحوم سے بھی زیادہ بہتر ادا کر سکتے ہیں ان کا دعویٰ ہے۔ ع

"ہمچو ما دیگرے نیست"

ان کے دوستوں اور خیر اندیشوں کو ہر دم یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں "انسداد دق" والے یو۔ این او کے شعبۂ صحت کے توسط سے ہالی ووڈ نہ بھیج دیں۔

جہاں تک موصوف کے محبوب مشاغل کا تعلق ہے وہ منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ طبیبوں اور ڈاکٹروں نے ان کے مزاج پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اب وہ خود بھی طب میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ہومیوپیتھی کے کیا کہنے! اب تو وبائی مرض کی طرح گھر گھر پہنچ چکی ہے ـــ اس میں تو خیر انہیں ید طولیٰ حاصل ہے ہی۔ دیسی طب سے بھی انہیں شغف ہے خاص کر وہ کبوتروں کی بیٹ اور خربوزوں کے چھلکوں سے کوئی دوا تیار کرنے کی فکر میں غلطاں ہیں غالباً کوئی کشتہ ہوگا۔ اس "ریسرچ" کے بعد وہ "سیڈو ڈنٹس اور برین ٹانک" پیش کرنا چاہتے ہیں جس کے استعمال کے بعد "خلاصوں" اور "گیس پیپروں" کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی ـــ کیونکہ امتحان دینے کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔ امید ہے کہ اس ایجاد سے "نوبل پرائز" مل جائے گا!!

یہ صاحب "زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے" کے بھی قائل ہیں۔ سگریٹ نوشی چونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا وہ خوب شوق کرتے ہیں۔ چائے تو خیر ہمارا "قومی مشروب" بن چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دماغ اور معدہ متفردیہ ہوجاتا ہے!! اس کے علاوہ وہ بھنگ، چرس، پاری انیون کو بھی نیشنلائز (Nationalise) کرنے کے حق میں ہیں۔ پہلے تو موصوف "کیفری کا سل" اور "گولڈ فلیک" سے شوق فرماتے تھے۔ اب اکنامکس کی بعض مجبوریوں سے متاثر ہوکر صرف اس کوالٹی کے خالی پیکٹ استعمال کرتے ہیں اور ان میں "ریڈ لیمپ" کے سگریٹ رکھتے ہیں اس سے ان کی روشن دماغی اور عالی ظرفی کا پتہ چلتا ہے"۔ "وضع داری" تو خیر ظاہر ہی ہے

جہاں تک پان کا تعلق ہے تمام پنواڑی ان سے پناہ مانگتے ہیں کیونکہ وہ دام دیکر پان لینے کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں، یہ پان کی توہین ہے لیکن ایک بات ضرور ہے۔ پنواڑی حضرات کے پاس آ بیٹھنے بیٹھنے سے ان میں غیر معمولی ادبی ذوق پیدا ہوگیا ہے اور اب تو کبھی کبھی غزل بھی ہوجاتی ہے۔ ہاں اس پان کی پیک کو وہ بڑے قرینے سے پھینکتے ہیں اس پیک سے کالج کے برآمدے میں موصوف جابجا سپنوڈ اور سپنوٹو کے نقشے بناتے رہتے ہیں اس سے ان کے سیاسی شعور پر بھی "اندھیرا" پڑتا ہے!!

اب اتنا کچھ کہنے کے بعد کینٹینلی بند کرتے ہیں اور چند باتیں امیدواروں کی رہنمائی کے لئے عرض کرتے ہیں تاکہ "سند" رہیں:-

امیدوار کی "تعلیمی قابلیت":-

تعلیم بڑی اچھی چیز ہے مگر ہزاروں افراد کے تجربے کی بنا پر عرض کیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں محترمہ کا تعلیم سے نابلد محض ہونا بھی ان صاحب کے لئے سراسر رحمت و برکت کا موجب ہوگا۔ کیونکہ موصوف پر جہیز کے بارے میں ملک کے بعض لیڈروں کے بیانات کا بڑا اثر ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سے اس زمانے میں شادی بہت بڑا مسئلہ ہے جس سے ملک کی معیشت کو گھن لگا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ صاحب غیر تعلیم یافتہ خواتین کے حق میں ہیں!

ویسے اگر کوئی پڑھی لکھی خاتون عرضی دیدیں تو ان کی درخواست پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا جاتا ہے البتہ ریاضی دان خواتین خدا کے لئے درخواست نہ بھجوائیں کیونکہ قوم کے غم میں ان صاحب کا پنجر جیومیٹری کا ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ اب اس پر باقی تو میل "تھیوریم" کے پرابلم حل کرنے کا کوئی محل نہیں!!

ذات پات اور جائداد:۔

محترمہ کے لئے ذات دات، ساگ پات، خاندان، علاقہ، آب وہوا، ضلع، ملک، براعظم کی کوئی قید نہیں۔ اسی طرح عمر، قد، صورت، ملکہ سیرت کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ البتہ ان کا صاحب جائیداد ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر محترمہ کے ورثاء وفات پا چکے ہوں تو مقام شکر ہے۔ اس بناء پر بیوگان کی درخواست پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

مصدقہ نقول:۔

صورت اور سیرت چونکہ ان صاحب کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا ایسی غیر اہم چیزوں کی سندات پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ بنک بیلینس، منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے صحیح اعداد و شمار سے ضرور آگاہ کیا جائے۔ اگر کلیم ہو تو "حادثہ بک" بھی ہمراہ لائی جائے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ زیادہ بنک بیلینس والی خاتون کا ٹنڈر قبول کیا جائے!!

تنخواہ:۔ "گورنمنٹ سکیل" کے عین مطابق ہوگی۔ مہنگائی الاؤنس۔ کنوینس الاؤنس کے علاوہ "میک اپ الاؤنس" بھی دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ پنشن کی مراعات بھی حاصل ہوں گی۔ چونکہ محترمہ کو مصروفیات زیادہ ہوں گی لہٰذا اس کی جائیداد کا جنرل مینجر ان کے میاں ہی ہوں گے!

نوٹ:۔

ایسی درخواستیں "امپلائمنٹ ایکسچینج" کی معرفت بھیجنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی طرح جواب طلب امور کے لئے لفافہ بھیجنے کی بھی ضرورت نہیں انشاء اللہ تعالیٰ جواب بیرنگ دیا جائے گا تاکہ بحفاظت مکتوب الیہ تک پہنچ سکے۔ امتحان اور ڈیٹ شیٹ کے لئے منتظر رہیں۔ تمام خط وکتابت صیغہ راز میں رکھی جائے گی!!

دربار نبوی کے انمول موتی

☜ حکمت کو اپنی گمشدہ چیز سمجھو۔ جہاں مل جائے لے لو۔

☜ اچھی حالت میں رہنے کا نام تکبر نہیں۔ تکبر تو لوگوں کو حقیر جاننے اور سچائی رد کرنے کا نام ہے۔

☜ جو چھوٹوں پر رحم اور بزرگوں کی توقیر نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں

☜ ایک شخص دوسرے کے لئے سچائی کا آئینہ ہے اگر کسی بھائی میں کوئی نقص ہو تو چپکے سے بتلا دو

☜ ایسی عادت بنا لو کہ اگر لوگ تم سے اچھا برتاؤ کریں تو تم ان سے احسان کرو اور اگر لوگ تم سے اچھا برتاؤ نہ کریں تو تم ان سے ظلم نہ کرو۔

(لطیف شہزاد)

غلام رسول آشنا
(بی۔اے فاضل)

طنز و مزاح

"نوشی و خوری"

عنوان کی زیارت کے بعد آپ سوچ رہے ہوں گے کہ راقم آثم "نوشی و خوری" دو بہنوں کی کوئی دردناک داستان آپ کی خدمت میں پیش کیا چاہتا ہے۔ اصل میں عاجز نابکار "نوشی اور خوری" کے روپ میں ایک ہی چیز کے دو پہلوؤں کی وضاحت کرنا چاہتا ہے۔ تو لیجئے میں دونوں کی شادی "تمباکو" سے رچاتا ہوں۔ ہو گیا واضح آپ پر — نوشی اور خوری، جناب تمباکو کے استعمال کے دو مختلف پہلوؤں کی تشریح ہے۔ "ہم خرما و ہم ثواب" تمباکو نوشی بھی اور تمباکو خوری بھی۔ کیا کہنے ہیں "تمباکو" کے۔ دنیائے نباتات میں بہت کم ایسے پودے ہوں گے جن کی ماشاء اللہ دو دو شادیاں ہوئی ہوں یعنی وہ بیک وقت پیئے بھی اور کھائے بھی جا سکتے ہوں۔

اوہو! میں کس فلسفہ کی دلدل میں پھنس گیا۔ دراصل مطلب آج کی صحبت میں "بندۂ پُرتقصیر" "تمباکو نوشوں اور تمباکو خوروں" کے متعلق کچھ عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔

ہمارے برصغیر پاک و ہند میں تمباکو کے استعمال کا رواج کچھ اس تیزی سے پڑا ہے کہ بندہ کی یادداشت کی گودڑی میں اس تیزی کی بہت نشاۃ بیان کرنے کے لئے کوئی مناسب لفظ اٹھتا نہیں لگ رہا۔ یہ مرض کچھ ایسی سرعت سے پھیلی ہے کہ ہیضہ میں اس کی تیزی کے مقابلہ کی طاقت ہے نہ طاعون میں، نہ چیچک میں، اور خبر تپ دق کی تو کارروائی ہی آرام سے تکمیل پاتی ہے۔ آجا کر انفلوانزا سے مقابلہ باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی اس پہلو سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ "سدا بہاری" کی نعمت سے محروم ہے۔ تمباکو کا مرض خیر سے نہ صرف "سدا بہاری" ہے بلکہ ...... اوہو میں پھر فضول بحث میں پڑ گیا۔ اچھا تو آئیے اب آپ کو تمباکو نوشوں وغیرہم کی دنیا میں لے چلیں — اس دنیا کا نام ہے "تمباکو" — آگے اس کے سیاسی اور طبعی لحاظ سے تقسیم کی ہوئی ہے۔ اس وقت ہمارا مطلب صرف سیاسی تقسیم سے ہے۔ سب سے پہلا ملک ہے "حقہ نوشی" — حقہ کی مناسبت سے یہ لوگ اپنے آپ کو "محقق" کہتے ہیں۔ (بارِ اعرابیہ قارئین پر) ان لوگوں کا سب سے بڑا ہتھیار ایک قسم کی توپ ہوتی ہے۔ اس توپ کی دو نالیاں ہوتی ہیں۔ "نڑے" یا "بانس" کی نرم و نازک شاخوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ ایک نالی پر بارود "پیالی" رکھی جاتی ہے۔ یہ پیالی کبھی کبھی "خاص" قسم کے "فوجی نخودوں" سے ڈھانک بھی دی جاتی ہے

"بارود پیالی" کو آگ لگانے کے لئے ایک "چٹا" کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ توپ کی تہہ میں ایک ننھا سا حوض بھی ہوتا ہے جو نکوٹین زہر کی مچھلیوں کو تیرنے کی مراعات مہیا کرنے کے لئے تعمیر کیا جاتا ہے جب "توپچی" توپ کو چلاتا ہے تو عجیب و غریب قسم کے سازوں کی آوازیں پیدا ہونے لگتی ہیں جہاں تک میرے سماع کا تعلق ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بہار کے موسم میں برسیم کی فصل میں باسی پانی کے اندر مینڈک کی بکواس کر رہی ہو۔ یا اگر یہ تمثیل "شہری طبقہ" کے لئے ناقابلِ یقین ہو کیونکہ انہیں اس خاص مینڈکی کی آواز سننا بہت کم نصیب ہوا ہوگا تو مناسب ہوگا کہ وہ کسی "بڑ بولی یا بڑ بولے" کا تصور اپنے ذہن میں لے آئیں۔ بندہ کے خیالِ ناقص کے مطابق مقصد حل ہو جائے گا۔

باشندگان طبی دنیا کے اندازے کے مطابق "حقہ نوش" ملک "دنیائے لمتیا کو" میں کئی قسم کی بیماریوں کا باعث ہوا ہے۔ چنانچہ اخلاجِ قلب قلتِ گرسنگی، مرگی، ہسٹیریا، سرچکرانا اور سرطان وغیرہ بیماریوں کے آثار اس ملک میں بکثرت پائے گئے ہیں۔

امیر توپچیوں کو تو بارود اور آگ مل ہی جاتی ہے اس ملک کے غریب فوجیوں کا بہت برا حال ہوتا ہے۔ بچارے صبح ہی صبح گھر گھر دستک دیتے پھرتے ہیں "اے بھائی پھتو! اگ بالی اے کہ نہیں" جواب ملتا ہے "ہے تیرا بیڑا غرق —

کدی تے آرام نال سون دیا کر" یعنی ہر روز صبح ہی صبح ناک میں دم کر رکھتے ہو کبھی تو آرام کی نیند سونے دیا کرو۔

پھرے گھر گھر کسی نے دی نہ اک آتش کی چنگاری
سزا اس خبث اعمالی کی پائے جس کا جی چاہے

"حقہ نوش" ملک کی اس مختصر روئداد کے بعد اب آپ کو "سگرٹ یا چرٹ نوش" ملک میں لے چلتے ہیں۔ اس ملک کے لوگ اپنے آپ کو "لوکو موٹو" — (Locomotive) کے نام سے یاد کرتے ہیں یوں بندہ یہ تصریح بلا جھجک کر دینی چاہتا ہے کہ یہ "لوکو موٹو" گدھوں اور خچروں کی مانند بار برداری سے کام نہیں کرتے بلکہ عموماً اس قدر کاہل ہوتے ہیں کہ اپنا بوجھ بھی ان کے لئے دوبھر ہوتا ہے۔ سگرٹ یا چرٹ ایک قسم کا "بیلن" ہوتا ہے جس کے گرداگرد سپرٹ آف الکحل میں تر کیا ہوا کاغذ استعمال کیا جاتا ہے — بیلن کے ایک طرف ماچس کی تیلی سے آگ لگا دیتے ہیں۔ "لوکو موٹو" تیار ہو جاتا ہے محلِ وقوع کے مطابق "بیلن نوش" کی صورتوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ چنانچہ دن کے وقت قریب سے دیکھنے پر "لوکو موٹو" معلوم ہوتا ہے۔ تو رات کے وقت دور سے نظر آنے والی روشنی دکھائی دیتا ہے جیسے ریل کی پٹڑی کے قریب "سگنل" گاڑا ہوا ہو۔ اور خطرے کی علامت کا اظہار مطلوب ہو۔ اہالیانِ میڈیکل ورلڈ نے "بیلن نوش" پر بھی وہی الزامات عائد کئے ہیں جو توپچیوں پر لگائے گئے ہیں کئی قسم کی بیماریوں کے "ٹانو" صرف توپچی شعبۂ بازو

اور بیلن نوشوں کے توسط سے ایک انسان سے دوسرے انسان کی طرف "ہجرت" کرتے پائے گئے ہیں۔

لگے ہاتھ سگریٹ ایجاد کرنے والے سے جو لطیفہ ہوا وہ بھی "معدہ یا دداشت" میں ہضم کرتے جایئے۔ یہ چرٹ کا موجد عیب تجربہ کے طور پر خود اس کو پی رہا تھا تو اس کے نوکر نے جو کہ پاس ہی بیٹھا تھا خیال کیا کہ غضب خدا کا آقا کے منہ میں آگ لگی جا رہی ہے۔ چنانچہ وہ پھولوں میں پانی ڈالنے کا فوارہ پانی سے بھر کر دوڑا۔ اور سارے کا سارا پانی خدمتگذاری کے بہت بڑے احساس کے ساتھ آقا کے منہ پر ڈال دیا۔ اس غلطی کی پاداش میں نوکر کو کیا ملا؟ اس موضوع کو ترک کرتے ہوئے میں صرف یہی کہونگا۔ کہ آج کس قدر افسوسناک بات ہے کہ نوکر اور آقا دونوں کے منہ میں آگ لگ رہی ہے اور پھر کوئی اس کو بجھانے والا نہیں۔ الامان والحفیظ!

"براعظم نوش" کے تیسرے ملک کی بھی سیر کرتے جایئے۔ اس ملک کا نام ہے "پائپ نوش" پائپ نہ تو "توپ" ہوتی ہے نہ "بیلن"۔ بس تھوڑے سے اختلاف سے اس کو "بڑے سے لاروے" سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اس ملک کے لوگ نہ "محقق" ہیں اور نہ "لوکوموٹو" جب یہ ان دونوں گروہوں میں شامل نہ ہوئے تو ان کو "پہاڑی کوّے" کہہ لیجیے۔ کیونکہ ان کا قصہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ بعض پائپ نوش تو خیر اتنے بے صبرے نہیں ہوتے۔ آہستہ آہستہ اپنے سینہ کو آگ لگاتے ہیں لیکن ایک دفعہ جبکہ خاکسار پاکستان کے جنوبی حصّہ کی سیر کر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک "پائپ نوش" کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہو گئی وہ اس انداز سے سانس الٹا الٹا کر پائپ پی رہا تھا کہ یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی خاموش بین بجا رہا ہو۔ یقین مانئے وہ کم از کم دو منٹ پائپ سے الجھا رہا۔ میرے اندازہ کے مطابق وہ دو گھونٹ میں اچھی بھلی پائپ کا کام تمام کر سکتا تھا

یہاں "بین" کا ذکر آیا تو مجھے حقہ، سگریٹ اور پائپ میں استعمال ہونے والے بارود کے زہر کی زود اثری کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

ایک دفعہ کسی افریقین نے ایک سانپ کی زبان پر تجربتاً تمباکو کی ہلکی سی مقدار رکھ دی وہ سانپ فوراً بل کھانے لگا اور اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ اور آخر اسی حالت میں ختم ہو گیا میں حیران ہوں کہ سانپ اتنا زہریلا جانور بھی تمباکو کی تاب نہ لا سکا۔ انسان کی دلیری پر افسوس ہوتا ہے۔ کہ وہ ناحق اپنی عمر عزیز کو زہر کے پیالے پینے میں صرف کر رہا ہے آخر کب تک اس کے جسم کا تریاق اس زہر کے اثر کو زائل کرتا رہے گا۔

اچھا تو صاحب! اس وقت تک ہم دنیائے تمباکو کے پہلے براعظم "نوش" سے بحفاظت گذر چکے ہیں۔ اب براعظم "خور" کی حد شروع ہوتی ہے۔ اس براعظم کا پہلا ملک "دردہ خور" ہے اس ملک کے باشندگان کو "زردالو" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ تمباکو کو کوٹ کر اس میں رنگ ملا کر

"براہ دہن" استعمال کرتے ہیں میں نے کئی "زرد آلوؤں" کو "زردہ" کھاتے مشاہدہ کیا ہے ان لوگوں کی رال ٹپکنی پڑ جاتی ہے - جگہ جگہ "ارض اللہ" پر بدنما داغ نظر آئیں گے - میرے خیال میں مرغیاں بھی "بیٹ" کرتے وقت ضرور حجاب محسوس کرتی ہیں لیکن یہ لوگ تو "تھوک تھو" کرنے کے ایسے عادی ہوتے ہیں کہ نہ اپنے کپڑوں کی ہوش ہوتی ہے نہ دوسروں کے آرام کا پاس - جب، جہاں، جیسے، اور جس وقت تھوک آ گیا - بیچاری صاف ستھری جگہ کا جنازہ نکال دیا منہ سے یوں لعاب بہہ رہا ہوتا ہے جیسے کل کا پیدا شدہ ننھا منا ہو۔

علم طب کے کھوجیوں کا کہنا ہے کہ یہ لوگ جگہ جگہ پر تھوک کر صحتِ عامہ کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں - اور ہیضہ کی وبا کے ایام میں یہ لوگ چلتی پھرتی کا کام دیتے ہیں - ان لوگوں کے مونہوں سے اس قدر سخت بدبو آتی ہے کہ کوئی شریف انسان مصاحبت کا شرف حاصل نہیں کر سکتا - ناچیز کی دعا ہے کہ اللہ ان پر رحم کرے - آمین

گھبرائیے نا صرف ایک اور ملک کی سیر کرا کے اور باقی کو مشروط بہ حیات کرتے ہوئے آپ کو واپس اشرف المخلوقات کی دنیا میں لے چلتا ہوں - تو حضرات! یہ ہے "بن تما کو خور" ملک - اس ملک کا اصل نام ہے "پان تمباکو خور ملک" سہل انگار طبائع صرف "بن تما کو خور" پر ہی اکتفا کرتی ہیں - اس ملک کے باشندوں کو "دو رنگے" یعنی وہ لوگ جن کی دو رنگی ہوں - ایک پان کی رنگ اور دوسری تمباکو کی رنگ اگر آپ چاہیں تو انہیں "دوغلے" اور اسی زمین بینا دقتوں بوجھیں بھی کہہ لیں - اس ملک کی آب و ہوا کم و بیش مذکرۃ الصدر ملک سے ملتی جلتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ "زرد آلوؤں" کی "پیک" برقانی رنگ" کی ہوتی ہے اور "دو رنگوں" کی "پیک" خونی رنگ" کی ہوتی ہے - باقی یہ بھی اللہ کی زمین کو اسی طرح گلزار بناتے ہیں - جس طرح اول الذکر لوگ وہ "سورج مکھیا" کے پھول کھلاتے ہیں تو یہ گلاب کے - مگر یاد رہے کہ بات صرف رنگ تک محدود ہے - یہاں تک ان پھولوں کی روح کا تعلق ہے - وہ تو ان لوگوں کے کارناموں سے ہمیشہ "لاحول" اور "تعوذ" کا ورد کرتے رہتے ہیں - طبی دانشوروں کا کہنا ہے - کہ یہ لوگ لعاب دہن کا خاتمہ کر کے ناحق اپنے معدہ کی کارکردگی کا خون کرتے رہتے ہیں -

بالآخر خاکسار تمام تمباکو نوش اور خور حضرات سے معذرت کرتے ہوئے یہ کہنے کی جسارت کرتا ہے کہ ہمیں اس رضا کارانہ زہر خوری سے جلد از جلد باز آجانا چاہیئے - اور معاشرہ کے ذخیرہ تریاق کو خواہ مخواہ ضائع نہیں کرنا چاہیئے - آخر تمباکو نوشی یا خوری ہے ہی کیا بس یہی نا کہ "زرد اور درد سر خریدیں"

طنز و مزاح

احمد جواد زاہد
بی۔ اے فائنل

"ہماری پہلی تقریر کے سوانح حیات"

تقریر کرنے کا کسے شوق نہیں۔ کون ہے جو حاضرین کو مسحور کرنے کی نیبرپی خواہش نہ رکھتا ہو۔ جو دھواں دھار تقاریر کرنے کا دلدادہ نہ ہو۔ ایک وقت ہم میں بھی یہ خواہش چٹکیاں لیا کرتی تھی۔ حسنِ اتفاق سمجھ لیجئے یا تقاضائے وقت کہ جب ہم نئے نئے کالج داخلہ لے کر تعطیلات میں گاؤں واپس گئے تو ہمارے کان میں بھنک پڑی کہ کل سکول کے ہال میں تعلیم یافتہ طلبہ مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کریں گے ـــــ ہم کالجیئٹ بھلا کب پیچھے رہنے والے تھے۔ چنانچہ تقریر میں حصہ نہ لینا اپنی کسرِ شان تصور کرتے ہوئے پروگرام میں حصہ لینے کا "مستحکم" ارادہ کر لیا۔

دوسرے دن بغل میں کتاب دبائے "مان نہ مان میں تیرا مہمان" کے مصداق سکول جا دھمکے۔ تمام "زائد" مقرر اپنے اسماء رجسٹر کروا رہے تھے مقرروں کی ایک لمبی قطار دیکھ کر ہمارے ارادہ میں کچھ پھسپھسا پن آ گیا۔ مگر جب "کمتر" لڑکوں کو ولولہ انگیز مقرر بنتے دیکھا تو ہماری غیرت کی ہنڈیا بھی یکدم اُبل پڑی۔ دل نے کہا۔ دیکھ کمبخت "وہ" کیسے پروانوں کی طرح گر رہے ہیں دل کا یہ فتویٰ سن کر ہم نے بھی کمال صفائی کے ساتھ نام لکھوا دیا۔

دو گھنٹے باقی تھے۔ ہر مقرر تیاری میں محو تھا کوئی طفرا سٹیج پر کی جانے والی ایکٹنگ کی ریہرسل میں مشق کر رہا تھا کوئی منہ لٹکائے آہستہ آہستہ "غیر مبہم" الفاظ گنگناتے جا رہا تھا۔ کوئی چلتے ہوئے اپنے جوش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ـــــ مگر ہم ان تمام باتوں سے بے نیاز درخت کی چھاؤں میں آرام سے یار دوستوں میں گپ بازی میں مشغول تھے۔ بھلا تقریر کی کیا فکر ہوتی ـــــ آخر ہم کالجیئٹ!! تیاری کرنا ہمارے نزدیک صرف "طفلِ مکتب" کا کام ہوتا ہے۔

گپ بازی کا پیریڈ ختم ہوا۔ دیکھا کہ تمام سامعین اپنی اپنی کرسیوں پر "پروانوں" کی طرح براجمان تھے۔ بادلِ ناخواستہ ہمیں بھی یار دوستوں کی مدد سے ایک کرسی پر "رکھ" دیا گیا ـــــ میں نہیں جانتا میرے دس منٹ کیسے گذرے۔ میرا ننھا منا سا دل جو کرسی کے دیدار سے ہی گھبرا گیا تھا لگا اب دریائے فکر میں ڈبکیاں لینے ـــــ اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ایک آدھ دفعہ غوطہ بھی کھا گیا۔ کنارے پہنچنے ہی والا تھا کہ مسٹر پریذیڈنٹ کسی کے متعلق ریمارک دے

رہے تھے۔" یہ کالج کے نونہال ہیں تقریر کرنے میں ماشاءاللہ ید طولیٰ حاصل ہے"۔ ید طولیٰ کا لفظ سنتے ہی ہمارا "نیم ڈیجیٹ" فکر چوکنا ہونے لگا۔ مگر اپنے ہاتھوں کو چند چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کا مجموعہ پاکر اطمینان ہوا کہ یہ ریمارک ہمارے "پاپسٹری" پر صادق نہیں بیٹھتے ——— اب پریذیڈنٹ صاحب گرج رہے تھے۔ گرج ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی مگر دماغ غیر حاضر دور کہیں مزعومہ سٹیج پر ڈانس کر رہا تھا۔

بالآخر ہمیں سٹیج کی زیارت کرنی ہی پڑی۔ سٹیج پر نمودار ہوتے ہی ایک تجربہ کار مقرر کی طرح سب سے پہلے ہم نے چھ نٹ مزب ڈیڑھ نٹ گہرا سانس لیا۔ پھر اپنی "عالیمرتبت" شخصیت سے مرعوب کرنے کیلئے سب حاضرین پر نظر دوڑائی لیکن جب کوئی مرعوب ہوتا نظر نہ آیا تو ہم خود ہی مرعوب سے ہو کر رہ گئے اور ہاتھوں کو یوں ملنے لگے گویا کھانا تناول کرنے کے بعد ہاتھ دھو رہے ہیں۔ سٹینڈ کا سہارا لیا تاکہ قوت عود کر آئے پھر دل کو کڑا کر کے تقریر شروع کر دی۔ ہم نے ابھی مسٹر پریذیڈنٹ کہنے کے لئے پر تول ہی رہے تھے کہ یکدم ایک باریک سی آواز ہمارے نحیف سے ڈھانچے سے کود پڑی ——— نہ جانے میں نے کیا کہا کہ تمام حاضرین نے ایک دلخراش بلند آواز اور دلشگاف قہقہہ براڈکاسٹ کیا۔ ریڈیو ابکنٹوینی نے میری رہی سہی ہمت کو بھی ختم کر دیا۔ ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ دل زور زور سے پسلیوں کو کوٹنے لگا۔ سانس میں "سٹیم" کی سی تیزی آگئی اور تمام خیالات دماغ سے کافور کی طرح دفع ہو گئے ——— اپنی ندامت کو چھپانے کے لئے سر کھجلانا شروع کر دیا۔ اور جب ہم نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ہم نے گھبراہٹ میں کوئی غلط فقرہ "چھوڑ" دیا ہو گا۔ دوبارہ مسٹر پریذیڈنٹ کہا۔ تو تمام حاضرین کی ایک دفعہ پھر باچھیں کھل گئیں۔

اب دو دفعہ کی ناکامیوں کے بعد میری حالت کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں بے حد نادم و پریشان بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ ادھر سامعین بڑے ذوق و شوق سے بار بار کہہ رہے تھے "کالجیئٹ صاحب" تقریر کیجیئے۔ کالجیئٹ صاحب تقریر کیجیئے"۔ ادھر میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "اگر کوئی تھر تھر پیما" آلہ ایجاد ہو چکا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ چیمپین شپ ضرور ہماری تھی۔ بولنے کی کوشش کی۔ زبان گنگ!! یوں محسوس ہوا کہ کسی نے منہ میں روئی ٹھونس دی ہے۔ اب نبضیں بھی سخت تیز ہو گئی تھیں گویا کسی "دوڑ کے مقابلے" میں حصہ لے رہی ہیں ——— مرجھا نے لگا سٹینڈ بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ تاہم میں نے اسکو مضبوطی سے گرفت میں لیا ہوا تھا۔ مبادا "یہ آخری سہارا" بھی مصیبت کے وقت بیوفائی کر جائے۔ اُدھر اسے خوب مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا ——— ادھر مجھے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا "کاش یہ سارا ہال سامعین سمیت زمین میں دھنس جائے۔ کبھی اس سارے تماشے کو "خواب" پر محمول کر کے دل کو جھوٹی تسلی کے جام پلاتا۔ اتنے میں ہال میں ایک "شعبدہ باز" نے بین بجانی شروع کر دی۔ اب مجھے اس فارغ البالی کے "زمانہ" میں اپنی کتاب کا خیال آیا چنانچہ میں نے اسے کھولا اور بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے زور زور سے پڑھنے لگا۔ زور خطابت نے تمام حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ آخری بڑی کامیابی اور سخت ناکامی سے ملی ہوئی تقریر کر جالہ بخشی کرداری۔ یہ ہے ہماری پہلی تقریر کے حالات زندگی جن

سعید انجم
بارھویں کلاس

دعوت

اس دن بھائی جان لندن سے تعلیم مکمل کرکے واپس آئے۔ میں بہت خوش تھا اور بازار جا رہا تھا سامنے سے جو اقی کو اپنے خیالوں میں مگن آتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ اِقی! ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"ہوں" اس نے بے تکا سا جواب دیکر مجھے شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن میں نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔ "ارے میرے بھائی جان آج صبح کی گاڑی سے آگئے ہیں۔" اس نے شاید مجھے شرمندہ کرنے پر کمر کس لی تھی بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ "تو میں کیا کروں؟" میں نے اپنی خفت مٹانے کیلئے ایک اور گیئر بدلا۔ "ارے تو تو پھر اس خوشی میں کل صبح ایک دعوت کھالو نا۔ نو بجے آجانا اور ہاں کریم، عقیل اور انیس وغیرہ کو بھی لیتے آنا۔" اچھل پڑا اور لگا باتیں بنانے! میں چلا آیا۔

* * *

اگلے روز کالج سے چھٹی تھی اور گھر والے صبح صبح بھائی جان کی معیت میں پکنک منانے چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا چھٹی بھی ہے تو کیوں نہ بستر میں مزے سے آرام کریں۔ اس لئے میں بستر میں لیٹا ایک ناول سے دل بہلانے لگا اور اس بات کو بالکل بھول گیا کہ کل اقی کو دعوت کے لئے کہا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی میں نے سوچا معلوم نہیں اسوقت کون میرے آرام میں مخل ہو رہا ہے؟ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو نو بجنے والے تھے اچانک موعودہ دعوت کا خیال آگیا چھلانگ لگا کر بستر سے باہر نکلا مجھے یقین تھا وہی ہونگے۔ جلدی سے کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑے اتار کر پہننے لگا۔ پتلون پہن چکا قمیص پہننے لگا۔ تو اس کا اوپر والا بٹن نیم شہید تھا۔ جھٹکا دینے سے شہید ہو گیا اس سے نچلے والا تو پہلے ہی شہید تھا اسلئے اس قمیص کو فوراً اتار کر رکھدیا اور بکس سے دوسری قمیص نکال کر پہننے لگا۔

دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ بلکہ کھرچا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو جوتے کیا پہننے ہیں ان سلیپروں کو ہی پاؤں میں ڈال لیتے ہیں اس وقت یوں معلوم ہوا گویا کوئی دروازہ پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے جلدی سے اونچی آواز کے ساتھ کہا۔ "ارے بھائی کیوں مرے جا رہے ہو۔ آ رہا ہوں۔"

اور جلدی سے پہنچ کر دروازے کو ایک جھٹکے کے ساتھ کھول دیا۔

لیکن وہاں دیکھا تو ہمارا پالتو ٹامی تھا جو مسلسل اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور میرے دروازہ کھولنے پر مجھے بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا

حضرت سیّد حامد شاہ صاحبؒ

علم بہتر ہے یا عمل بہتر
سب سے پہلے ہے اس کا حل بہتر

بے عمل عالم عمائلِ جاہل
کون ان سے ہے آج کل بہتر

علم گویا ہے اک زبانِ عمل
جس سے کھلتا ہے سب بیانِ عمل

علمِ کامل کو ہے عمل لازم
واقف اس سے ہے رازدانِ عمل

علم سے جب نہیں عمل پیدا
فخر اور ناز اس پہ ہے بیجا

علم گر ہو تو پھر عمل بھی ہو
ایسے عالم پہ ہم تو ہیں شیدا

عالمِ بے عمل تو ہے فٹ بال
جو بہ میدانِ نفس ہے پامال

ایسا عالم کہیں ہو کوئی ہو
ہر طرح سے ہے وہ شامتِ اعمال

زیورِ علم جب عمل میں نہیں
وہ عمل کب ہے قابلِ تحسیں

ایسے عامل سے چاہیئے پرہیز
جہل پر جس کا ہو مدار و یقیں

علم وہ جس میں ہو خدا کی شناخت
حق کی خاطر ہو خور اور پرداخت

ایسا عالم ہو جس میں خوفِ خدا
اس سے طرزِ عمل کرو دریافت

نہیں جاہل میں خوبیٔ تدبیر
مگرِ شیطار اگا ہے وہ ہے نخچیر

اس کو حاصل نہیں ہے حسنِ عمل
اس کی تو ہے بگڑ چکی تقدیر

علم جس سے نہ ہو ادب حاصل
علم اور جہل میں وہ ہے فاضل

ایسے عالم کو ایک جاہل پر
شرف کیا ہے کہ سمجھیں اب فاضل

عالم باعمل ستارہ ہے
دور سے اس کا گو نظارہ ہے

نورِ دیں چشمۂ ہدایت ہے
جس نے علم و عمل سنوارا ہے

حضرت قاضی اکمل صاحب

جام و مینا میرے ساقی تیرے میخانے کی خیر
حرص رہ جائے نہ باقی تیرے میخانے کی خیر

نہ تو ملّا سے ہو رغبت نہ ہو صوفی سے عناد
کر دے دلبر سے ملاقی تیرے میخانے کی خیر

ایسا اک جام ملے کوئی ہوس رہنے نہ دے
پیارے ساقی، میرے ساقی، تیرے میخانے کی خیر

جلد تدبیر ہو محبوب سے جا ملنے کی
ہُوا جاتا ہوں مراقی، تیرے میخانے کی خیر

ایسی پلوا کہ نکل جائیں ہمارے تن سے
سبھی امراضِ نفاقی، تیرے میخانے کی خیر

جستجو میں تیری کانٹوں پہ چلے جنگل میں
راحتِ خوابِ رواقی، تیرے میخانے کی خیر

دیدے اک جام کہ دم لیکے سناؤنگا تجھے
قصّۂ لیلِ فراقی، تیرے میخانے کی خیر

دلربائی ہے کہ دل لے کے ہو دلداری بھی
یہ تو فرّاقی ہے ساقی، تیرے میخانے کی خیر

اس لئے کہتا ہوں دلدار فقط اللہ ہے
تا ابد ہے تُو ہی باقی، تیرے میخانے کی خیر

حلق میں ڈال میرے قطرۂ آبِ حیواں
کہ ہُوں ہمیارِ فواقی، تیرے میخانے کی خیر

عرش تک کی میں خبر لا کے دکھاؤنگا تجھے
دیکھنا میرے براقی، تیرے میخانے کی خیر

یہ تو پیغام ہے اکمل کا بحالِ فرقت
باقی پھر عند تلاقی، تیرے میخانے کی خیر

شیخ روشن دین تنویر

○

ہے وہ سُبک قدم مری زندگی کی راحلہ
بڑھ کر میں حادثات سے نصفِ راہ میں ملا

باغِ بہشت اگرچہ ہے باغِ بہشتِ جاوداں
باغِ بہشت بھی کہاں دردِ حیات کا صلہ

لوحِ مقدر اے خدا میں نے تو کچھ لکھی نہیں
دیکھ کے نامۂ عمل تجھ کو نہ چاہیئے گلہ

اپنے عمل کے واسطے اور قضا کہاں سے لوں
توڑ سکوں نہ میں اگر دامِ قضا کا سلسلہ

لایا ہے مجھ پہ سینکڑوں انقلاب آسماں
اپنا قدم جگہ سے تنویر ذرا نہیں ہلا

پروفیسر محمد شریف خالد

نہیں یہ زندگی منت کشِ نام و نشاں ہرگز
نہیں تبدیل ہوتا اس سے یہ دورِ جہاں ہرگز

اگر نادر تلاطم ہو کسی کی کشتیِ خستہ
اے ہمدم کم نہ ہوگی تندیٔ آبِ رواں ہرگز

جلایا بجلیوں نے خرمنِ امید کو یکسر
نہیں اب تو کوئی خوفِ بلائے ناگہاں ہرگز

ہے غمخوار سب اغیار عسرت کا یہ احساں ہے
فراغت میں مجھے ایسا نہ تھا وہم و گماں ہرگز

مقرر ہے ازل سے روز و شب کی گردشِ پیہم
نہیں کرتی اثر اس پر زمانے کی فغاں ہرگز

ہے عبرتناک انجام اس چمن کے ہمنشینوں کا
بنائیگا نہ یہ مرغِ حزیں اب آشیاں ہرگز

اگر ہر بار ٹھکرائے وہ عرضِ مدعا میری
نہ جاؤنگا مگر میں چھوڑ کر یہ آستاں ہرگز

یہ دنیا اک تماشا ہے عجب اطوار ہیں اس کے
اے خالد تو نہ پائیگا جہاں میں رازداں ہرگز

ارشد کرمانی

اک رہگذارِ شوق کا بجھتا دیا ہوں میں
یا اک شکستہ ساز کی مدھم صدا ہوں میں

گلہائے رنگ رنگ کھلاتا ہے میرا فکر
باغِ غزل میں گویا برنگِ صبا ہوں میں

سینے میں بے پناہ تلاطم ہے موجزن
کیا جانے کس خیال میں کھویا ہوا ہوں میں

لایا ہے اس مقام پہ مجھ کو مرا جنوں
ہر ایک سے اب اپنا پتہ پوچھتا ہوں میں

لو مل گئی ہے مجھ کو مری منزلِ مراد
لو ان کے نقشِ پا کا پتہ پا گیا ہوں میں

محفل میں میرے دم سے دھواں تھا نہ روشنی
اے شمع تیرے ساتھ اگرچہ جلا ہوں میں

رہ میں تو کوئی بھی نہ ملا مجھ کو راہزن
منزل پہ اپنی آکے ہی ارشد لٹا ہوں میں

ارشد ترمذی

شد مزیّن از لبِ لعلِ تو دیوانِ غزل
گشت آں زلفِ پریشانِ تو عنوانِ غزل

من ز خونِ دل کہ می ریزم ز دردِ فرقتت
لعل ہائے احمریں بخشم بہ دیوانِ غزل

تا بُتِ رعنائے من گردید سُلطانِ غزل
از ثریّا شُد فزوں تر شوکت و شانِ غزل

چوں حدیثِ قدِّ بالائے تو آمد در غزل
رشکِ فردوسِ بریں گشتست بُستانِ غزل

ترمذی در وصفِ روئے تابدارِ آں صنم
ماہ و انجم را د افشاں در شبستانِ غزل

مصلح الدین صاحب راجیکی مرحوم

یہ بھی ہے ایک حادثہ گردشِ روزگار کا
اس سے پڑا معاملہ دیدۂ اشکبار کا

جس سے ہوئی نہ مخلصی جانِ حزیں کی آج تک
ایسا ہی کوئی پیچ ہے گیسوئے تابدار کا

حسنِ ازل نواز بھی جلوہ نمائے دہر ہے
ہم نے ہی نور کھو دیا دیدۂ انتظار کا

سیرِ چمن سے آپ کو فرصت اگر نصیب ہو
کیجیے کچھ مشاہدہ سینۂ داغدار کا

نوحۂ بیقرار کو سنیئے کہ یہ بھی ساز ہے
چشمِ رواں کو دیکھیے منظر ہے جوئبار کا

جتنی بھی ہے وہ ڈال دے کاسۂ خاکسار میں
شکوہ نہ ہے نہ دہر میں ساقیٔ نامدار کا

مجھکو تو اعتبار ہے ان کی نگاہِ مہر پہ
دل کو بھی اعتبار ہو گردشِ روزگار کا

پھولوں بھری بہار سے کچھ بھی نہ ساتھ لے چلے
یارب بُرا ہو دہر میں دامنِ تارتار کا

نظرِ کرم اٹھائیے جامِ وصال دیجیے
ایسا بھی کیا قصور ہے مصلحِ خاکسار کا

فیض احمد اسلم

○

قطرے میں دیکھ سکتا ہے دریا کہیں جسے
رکھتا ہے گر تُو دیدۂ بینا کہیں جسے

جچتا نہیں ہے کوئی نظر میں ترے سوا
کوئی نہیں جہان میں تجھ سا کہیں جسے

آنکھوں میں تیرے حسن کے جلوے ہیں نوفشاں
سر میں ہے تیرے عشق کا سودا کہیں جسے

ہاں اے مسیحِ وقت مریضوں پہ وہ نگاہ
ہر دردِ لادوا کا مداوا کہیں جسے

ساقی کی مست مست سی آنکھوں سے بارہا
ہم نے وہ چیز پی ہے کہ صہبا کہیں جسے

لے کر چراغِ داغہائے دل بڑھے چلو
روکے نہ راہ لوگ اندھیرا کہیں جسے

ناکام ہوں گی فیضؔ سبھی اعدا کی کوششیں
ہونا وہی ہے آپ کا چاہا کہیں جسے

لطف الرحمٰن محمود

○

اہلِ نظر پہ رازِ نیازِ عشق کو آساں ہونے دو
پروانے کو شمع کی لَو سے دست و گریباں ہونے دو
معصوم جفاؤں پر نادم کیوں ہوتے ہو کچھ صبر کرو
بے لوث وفاؤں کے خُوں پر مجھ کو بھی پشیماں ہونے دو
کیوں اتنی جلدی ڈوب رہے ہو داغوں کے اے مہ پارو!
اس دل کی سُونی گلیوں میں کچھ دیر چراغاں ہونے دو
اس چشمِ تلطّف پر کچھ دن تعزیر کے پہرے بٹھلاؤ!
اس سوزِ نہاں کی دولت کو کچھ اور فراواں ہونے دو
منصور کی رُوح کو پہنچانے دو دل کو ثوابِ سوزِ غزل
محمودؔ کو دارِ دار سے یارو آج غزل خواں ہونے دو!

خلیق اختر چودھری
بی۔ اے۔ فائنل

جلوۂ حسن رونما نہ ہوا
دل کا روشن کبھی دیا نہ ہوا

لذتِ درد سے نہیں آگاہ
عشق سے جس کو واسطہ نہ ہوا

ہم نے در در کی خاک چھانی ہے
پر کوئی اپنا آشنا نہ ہوا

تم سا ہوگا نہ شمع رو کوئی
کوئی تجھ سا بھی دل جلا نہ ہوا

ان کے ملنے سے چین آتا ہے
عشق کا درد لادوا نہ ہوا

جس کو کہتے ہیں خلد کی بستی
ان کے کوچے کا راستہ نہ ہوا

مہ جبینوں کے شہر میں اختر
نہ ہوا ان سا دلربا نہ ہوا

عابد ربانی
ایف اے۔ سال اوّل

جو دنیا ہم سے ہے بیزار تو بیزار رہنے دو
یونہی آوارگانِ شوق کو بیکار رہنے دو

علاجِ گردشِ دوراں نہیں چارہ گری میری
غمِ جاناں سے میں بیمار ہوں بیمار رہنے دو

غموں کی دھوپ سے گھبرا کے آیا ہوں ترے در پر
ذرا سی دیر زیرِ سایۂ دیوار رہنے دو

مرے چارہ گرو! مرنا مرا آساں سہی لیکن
مرا جینا اگر دشوار ہے دشوار رہنے دو

بھلا ڈالو، مٹا ڈالو، کلامِ عابدِ ناداں
جو ان کی یاد کے مظہر ہیں وہ اشعار رہنے دو

ناصر احمد باجوہ
بی۔اے (فاضل)

غزل

واللہ کیا خوب شان پائی ہے
مرلقائی ہے دلربائی ہے
روئے جاناں و رنگِ گل ہی نہیں
ہر حسیں چیز دل کو بھائی ہے
تیری زلفوں کے اس اندھیرے میں
دل نے اک روشنی سی پائی ہے
جانے کیسی نظر سے دیکھا تھا
دل میں اک آگ سی لگائی ہے
تیرا دیدار کتنا ناممکن
کتنی جانسوز یہ جدائی ہے
اُن کی اُلفت میں ہر گھڑی ناصر
میرا شیوہ غزل سرائی ہے

رضا گیلانی
بی۔اے (فاضل)

غزل

ہم سے ملنے میں عار کیوں آخر
دوسروں ہی سے پیار کیوں آخر
پھول سب جھولیوں میں غیروں کی
مانگ میں میری خار کیوں آخر
کھل سکا نہ اگر یہ غنچۂ دل
آ گئی تھی بہار کیوں آخر
کس کے غم میں ہے نالہ کش بلبل
گل ہے سینہ فگار کیوں آخر
ہر کوئی وقفِ رنج و سختی ہے
میرے پروردگار کیوں آخر
سو دفعہ جن کو آزمایا ہے
ان پہ ہی اعتبار کیوں آخر
ہم ہیں کتنے وفا شعار رضا
اتنے سرکش نگار کیوں آخر

AL-MANAR

APRIL, MAY, JUNE

1963

Talim-ul-Islam College

Rabwah

MAGAZINE

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College
Rabwah

April, May, June
1963

Chief Editor
IJAZUL HAQ QURESHI
Editor
HASSAN MUSTUN

Contents

	Pages
Editorial ...	1
Friend ...	3
Ijaz-ul-Haq Qurshi B.A., (Hons.) Part III	
Music, Dancing and Dramas ...	5
Dr. Muhammad Ramazan	
Jingling with Words ...	9
Ata-ul-Mujeeb Rashid, B.A., Part II	
The Sequel ...	10
Mansoor Muzaffar Sheikh XII Class	
Administration of Sultan Tipu ...	12
A. Jawad Makhdum B.A., Part II	
Student Life ...	16
Junaid Hashmi	
Preserverance of Hazrat Abu Bakar ...	19
Sarfaraz Tariq B.A. (Hons.) Part III	
Appointments ...	21
On Teddyism ...	22
Shahid Ahmad Khalon XII Class	
Formalities ...	24
Khalil-ur-Rehman XI	
Donations ...	26

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah and Published by
A. R. Junaid Hashmi B.A., for T. I. College, Rabwah.

بسم الله الرحمن الرحيم نحمده ونصلي على رسوله الكريم

AL-MAMAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE, RABWAH

MAGAZINE

Vol. XII | April, May, June 1963 | No. 3

Editorial

Gone are the days when man was devoid of civilization and ignorant of even the three R's. Now-a-days the school-master is abroad and every country is taking special pains to impart education among its masses in order to make its mark in the comity of advanced nations. In Pakistan, too, the schools and colleges are being increased in number so that the younger generations may acquire the necessary knowledge to keep themselves abreast of the time. The Government spends lots of money on educational development schemes. So it is the duty of the students to avail themselves of this golden opportunity and thus fulfil the high hopes of their country.

But the students must remember that to solve some mathematical enigmas, learn some scientific facts, read some past events of history or know some economic problems is not the sole object of their education. On the contrary, the college is their training-ground in every aspect of life. Along with solid facts of knowledge the students are to learn certain other things too. They are to absorb the etiquettes of a civilized society in the real sense. They are to become civil and cultured ; they should make a point to observe the dignity of others so that they in turn be treated honourably. They should never trespass the bounds of civility in any function of the college, though it may not

be a very serious one such as college debates etc. It is very essential that they should inculcate such a spirit in themselves that once they are forbidden to do a thing by their elders, they should bow in allegiance once for all.

The most important thing which needs special attention is the respect for teachers. Unless and until, the students venerate their teachers, they can't reach the apex of progress. If a student does not have pristine love and honour for his teacher, he can't receive due regard from his teacher which is a vital factor in acquiring education. Thus in order to gain distinction in academic career, the students ought to pay due attention to this matter. They should never commit any such action which may incense his teacher.

There is yet another indispensable factor for gaining remarkable achievements in life and that concerns the students themselves. That is to say, their ideals must be high and their efforts should always be directed towards attaining lofty objects. They should not be satisfied with mean achievements and rest on the oars. Those who are to become great men do not behave like this. On the other hand they proceed from smaller achievements to bigger ones. If Qaid-i-Azam had become satisfied with the mere autonomous status of Muslims within an Hindu State, the greatest Muslim State of Pakistan would never have seen the lignt of the day. It was due to the high ideal of that indomitable personality that the birth of an independent homeland for the Muslims of Indo-Pak sub-continent was due. Thus it is inevitable for the students of today—the leaders of tomorrow—to avoid pusillanimity and aim at high ideals.

In short, however insignificant the afore-said facts may appear, the students ought to bear them in mind and resolve to act upon them for they are the key to the door of success in life.

Ijaz-ul-Haq Qureshi B.A. Hons. Part III

FRIEND

O Friend! You are the indispensable spice of man's life; but for you his life would be dull and monotonous for he is neither 'a beast nor a god who can live in solitude'. When man is encompassed by interminable troubles of the world; when he stands discredited at the hands of his fortune and feels himself alone, the very sight of yours, O friend, makes him oblivious of himself and he feels his spirit soaring on high altitudes above the sordid pursuits of life. What a fine thing! It's you, O friend, whose memory made Shakespeare contempt kings as compared with you and he declared:

> "...Thy love remembered such wealth brings,
> That then I scorn to change my state with kings".

O Friend! You are the saviour of man's ship of life when it is sailing adrift and is well nigh wrecked: your faithful counsel in delectable times rescues many a soul. O friend, when man is flared up with exasperation, you can soothe his evil passions; when he is in the wrong but confesses it not, it's you who can make him realize his fault; when he is encircled in evils your virtuous influence can make him shun his evil ways; when he is going to mar his career, you can feel his pulse and divert his ways into healthy channels.

O Friend! It's you who can save a man who is on the verge of being drowned in the ocean of flattery and adulation. It's you who can make him realize his ownself.

O friend, whereas your infinitesimal good act is a source of incalculable pleasure, your smallest act of torture seems to be a rock of troubles. Even a 'flower' struck by you with evil motive strikes more forcibly than a stone of an enemy. It was acute feeling of love for you which made Mansur weep bitterly when Shibli struck him with a flower while he was stoned by his enemies. Others may speak ill of a man but it can't be expected from you, O true friend!

O friend, you are the person with whom one can exchange one's views frankly without any fear of reproach. No earthly device can design a more calm atmosphere of give and take than you! Man has so many passions and sentiments to which he can't give vent anywhere else than you. Your greatest service, O friend, is "the ease and discharge of the fullness and swellings of the heart which passions of all kinds do cause and induce." A hearty talk with you, indeed, gives an immeasurable relief!

O friend, it's you who can perform the meritorious function of speaking in commendation of one's abilities. It's only from your mouth that words of esteem look beautiful. But for you one would blush at one's self-praise; you are the mouth-piece of one's dormant capabilities.

O friend, nothing is more valuable than you when you are true and faithful and nothing is more harmful than you when you turn coat and become treacherous: enemy can exploit you even in taking the life of man. But for trust in your deceptive friendship, Julius could never have been murdered by Brutus.

O friend, your tongue is a double-edged sword. Whereas your praise can elevate a man, your blame can degrade him in others eyes; whereas your good influence can lead one to constructive side, your evil influence can lead one to destructive side and entangle him in manifold vices. Ah! what a mighty power you possess!

O friend! Be true so that one may confide you; be virtuous so that one may eschew from vices; be faithful so that one may expect true help from you in straitened circumstances; be well-wisher of others so that they in turn abstain from sinister motives about you.

O friend, fulfill these conditions so that to bask in your sunshine may be an enviable blessing and tie the knot of your friendship so fast that time may not unitie it!

Music, Dancing and Dramas

It is an irony of fate that the Muslims who once were the torch bearers of Islamic light and learning have reduced themselves to mere serfs and camp followers of western civilization which glitters but is not all gold. They were the champions of propagating the heavenly truth with honesty and humility, steadfastness and and courage and never adopted an apologetic or defensive attitude as generally done by some of the present day Muslims who even do not hesitate to put false constructions on Islamic teachings to suit their own ends. The reason is not far to seek. In this age of materialism and in the absence of love for his Creator and resultant lack of mental contentment and spiritual solace, the frustrated man is wrongly and willfully trying to find these in the use of narcotic drugs as well as in music, amorous shows and literatures. Pooh! for a bad bargain. Some New Muslims plead this with gusto and their blasphemous ideas are published like nude pictures for portraying, as they allege, the artistic female curves, in the columns of Newspapers which profess to advocate the cause of Islamic culture. What a fantastic and moraliy destructive notion of Islamic art and culture! God save us from these well-wishers of the people. Perhaps they do not think, in their hot-headedness, that they will have to answer for their actions on the Day of Reckoning for beguiling the innocent people from the right path.

It is high time we practised what we preach and thus be able to save humanity from moral and spiritual disaster. Let us, therefore, come back to God and His religion and thereby learn what is right and what is wrong. To imitate the West blindly, in every thing, will lead us nowhere. It is cowardice to shun the stage of life which demands from every one of us, firm faith and pious actions to attain salvation, and take to the pseudo stage of fun and frivolity. Muslims all over the world are on the cross-roads at this juncture. Some are arraying themselves against one another and committing bloodshed of the most abomin-

able kind. Let us, therefore, one and all come to their succour by guiding them to the true path of piety and peace. If we fail to do this, it will only mean that we are left with no mettle to face the battle of life which is real and earnest and trying to mosquerade over true character under the artifice of "cultural activities". Real art is synonymous to life itself which is creative, progressive and dynamic, not static and filthy, leading to baser animal instincts. On the contrary it leads one to the higher realms of nobility and morality resulting in the selfless service of his Creator and humanity at large.

Music, dancing and love dramas are mental intoxicants like liquor, opium, tobacco, tea etc. which are drugs meant for patients and not like edibles for routine use. The natural law about the use of things that they are beneficial in one form and injurious in the other should never be forgotten e.g. (1) grapes, wheat, barley etc. are health-giving when taken in their proper forms but become deleterious, if consumed after decomposition, which turns them into Alcohal. (2) Tea makes, especially in cold climates, a good warming beverage, if only taken as an infusion, i.e. boiling water poured over a pinch of tea leaves in the kettle which is immediately covered. This process will only liberate aroma from the tea leaves and not the poisons i.e. tanine etc. which are set free if the leaves are boiled or allowed to stand in boiling water for a long time. Tea also belongs to the series of those drugs which first stimulate and then benumb and ultimately stagnate human senses and higher centres. This stimulation or stagnation varies in intensity in different drugs. It is initial feeling of hilarity that leads man to the addiction of these drugs, which becomes very difficult to give up afterwards and results in various bodily and mental ailments, viz. palpitation and dilatation of the heart, liver and stomach troubles, nervous irritability, dizziness, forgetfulness and finally complete disparagament of all human organs and functions. Similarly, music, dancing and dramas have their good and bad points:

(1) **Music** may be useful, if prescribed by physicians, for particular mental patients (not the mentally depraved ones). It is also useful in a battle array. Melodious voice may be used for reciting the Holy Quran and morally good poems by men and women in their respective gatherings but not as a profession or pastime nor with musical instruments and rythms. Nature is all music. Every tiny twig, a ruffling

leaf of a tree or a blade of grass or chirping of birds has a complete symphony and divine message for you. Listen to it with devotion and attain unison and concord with Nature. Pseudo and distorting musicians will play havoc with your nerves and lead you astray from the right path.

(2) **Dancing**: Dance to the tune of your inner conscience by entirely submitting yourself to the will of God and His prophet (Peace and blessings of God be upon him!) and following the Law of Religion as well as the Law of Nature in an harmonious whole rather with the lewd girls and boys. The former is calling you for a chaste, simple and serving life, the latter for a corrupt and idle one.

(3) **Love dramas**: Life itself is a great drama. Act it honestly and courageously than play the buffoon on the false and gay stage of theatrical performance. Moreover, you have the legitimate relations to bestow your love upon parents, brothers, sisters, wives and children, your friends and the world family of God's creatures on this earth. Why, on earth, should you hanker after unfair loves and betray the great trust reposed in you? Doesn't it mean that you are hopelessly and sinfully lacking in the true grasp of (i) Faith and (ii) Action (faith full of conviction, mind replete with right thinking and right planning and spirit bounding for right, perpetual and selfless actions) i.e., the full play of the powers of your body, mind and soul?

Philistinism, melodramas, profanity etc. are not the things a true Muslim should adopt. He should rather seriously follow the following two laws ordained by God and thus fulfil the purpose of his life in the world:

(1) **The Law of Religion**: By following this special law, man can please his Master and achieve success in this world and the world to come. Its speciality lies in all-goodness and in being quite contrary to the law that man has made for himself to serve his vested interests and which has been the cause of all human miseries.

(2) **The Law of Nature**: Though strictly speaking, is a part of the former, but it becomes a separate entity when looked upon from a different angle of vision. As such its application is solely confined to the worldly domain and it benefits even those who do not like to follow the dictates of religion. "There is no com-

God in the Holy Quran. By following it, they can only gain material benefit and mainly serve themselves.

This brief description of the above two laws was necessary as it is by neglecting them and taking to false ways and means alike that the Muslims have come to see the evil day and are perhaps (God forbid) heading for a greater catastrophe. They should never forget that it was by following this religion that they reached the highest pitch of glory and not the present day innovations of "cultural activities". True religion in not at variance with true science as the former is the Word and the latter the Act of God. That is why the early Muslims in their hey-day of life made tremendous studies in every branch of science while others are now stealing a march on them. By ignoring religion, they cannot even make worldly progress, while other people can. They should, therefore, call a halt on their misguided gramme as practised by their ancestors and keep themselves busy by putting in good hard work and doing mental and moral research. They must not, therefore, idle away their precious time, otherwise, the devil is sure to work his way into thier brains. 'An idle man's brain is the devil's workshop', goes a proverb. They should not hope to make any progress, unless they actually bestir themselves and act as true Muslims. They have an examplary precedent in their fore-fathers which they must emulate and cast away the fond 'slough of despond', as no artistic glamour or slavish mentality is going to help them out of the present quandary. They have to stand on their own legs and to be really God-fearing, braver, just and serving to His people, not by mere word of mouth, but by actual DEED that is humbly done by them at their places. Better days lie ahead of them. God did so ordain it.

Jingling with Words

A sixth class student may take pride and feel indescribable delight in cramming up this cleverly designed sentence: 'I saw a saw which could not saw'. And no doubt he is justified in the pride. It is an admitted fact that a trimmed assortment is much more attractive than a diffused and scattered one. Of course, every word of every language has its own beauty; but it depends upon the writer to mar, maintain or enhance it. I don't want to drag you into any serious discussion. The point I want to assert here is that even the ordinary words, if used after due deliberation and clever calculation, give a queer sort of mental pleasure.

Repetition of the same word is not always appreciated. But if we use the same word over and over again, with its new meaning every time, I am sure the sentence will become more pleasant and attractive. This is due to the sweet-sounding effect of the sentence.

Once in my school days, one of my friends told me the following sentence:

"I like to spring in spring like spring on spring by the spring that springs from our fields."

And believe me, the sentence sprang a surprise on me. I had to devote some time for looking these words up in the dictionary and then a few moments more to eulogise the skill of the man who made such a crafty sentence.

Night and days continued to excel each other and time crept on imperceptibly with stealing steps but a hidden desire never parted with me—a desire to compose a sentence on the same pattern. I put in my best, but all my efforts ended in smoke. I continued and at last I got what I had been struggling for. I put that sentence here in order to provide incentive for your dormant intellectual capacities and induce my fellow students to start this practice as their hobby in spare time. I assure you that incessant efforts

Continued on page o

Mansoor Muzaffar Sheikh XII Class

The Sequel

The paramour of night had begun to split her black hair; the blue sky was over-cast with clouds; darkness was growing thicker and thicker save the tiny beams of the moon struggling to reach the earth; nothing could be seen distinctly except when the lightning flashed. Pin drop silence prevailed except the rustling of leaves of trees growing on the river-bank, few and far between. By and by the clouds were becoming thicker and when they thundered like shots from huge guns, hearts suffered a serious shock.

Through this deserted and harrowing scene, Anjam was passing. His heart was heavy; he could not walk a step further. So he sat by the trunk of a tree on the river bank, his mind engrossed in deep thoughts.

Sunk in the recollections of past events of his life, Anjam sobbed. He remembered his palmy days when he was a millionare and rolled in the lap of luxury. He had gathered all earthly amenities; the servants were at his beck and call; he had no worries, no anxieties. He had friends in plenty with whom he passed his days with great enjoyment. Sometimes they played at cards, sometimes chess. Having fed up with this, they would either go to pictures or some lively theatre. Gamboling was also their heartiest pursuit. Anjam was not a past master in this art and he rarely won. Time rolled on; his wealth continued to be wasted in idle pursuits. His inadvertence in his business caused a serious deficit. By and by his hoarded wealth was all consumed.

Ah! Anjam could not look into the irony of fate! A day came when he was defeated in gamboling and even the house in which he lived had to be lost. His wife, a pious and virtuous lady, had very often tried to mend the ways of her husband, but when she discerned that all of her exhortations were to no avail and that one day he might lose her too in gambling, she resolved to sever her relations with him so that she may

save herh onour. She had taken divorce two years ago. Anjam was left without a wife who could sympathise with him in his distress; without a child who could be a support in his old age.

One day Anjam's house was a rendezvous where his mealy-mouthed friends danced attendance upon him. Now he was left friendless and homeless—alone to suffer the pangs of poverty and afflictions of penury. To-day he had no sympathizer to appease him, no benefactor to retrieve him from wretchedness, no friend to shed tears on his miserable plight

To-night he had not even a single piece of bread to keep his body and soul together. There was no other remedy except begging. But would he beg? No, no. His conscience was condemning him to stretch hands for begging. At last he came to an old friend of his to lend him the least amount of money he could afford. With great courage and hope, he knocked at the door. After a while the door opened. Seeing the face of his old friend, Anjam made the audacity to request for a few rupees. "Off with you! ... Here is no friend of yours", came the simultaneous reply and immediately the door was shut.

Receiving this point-blank refusal Anjam became bewildered and outwitted. He was foodless, homeless, freindless! He was out of himself. It seemed as if he was losing the equalibrium of his mind.

The night was becoming darker and darker. Cold winds were becoming intense and were piering the partly-clad body of Anjam. Anjam was going to an unknown place — far from the din of the city — far from this illusory world. He had reached the river-bank when his legs could no longer carry him further. He sat absorbed in deep thoughts.

The clouds had become thicker : the lightning intenser. Thundering clouds trembled Anjam and his heart would sink. After a few minutes there appeared a dazzling light with a burst of thunder in its wake. The huge tree had crashed Anjam's soul had gone to the next world.

The dead mass of his body was lying motionless on the ground.

———

A. Jawad Makhdum B.A. Part II

Administration of Sultan Tipu

(Generally whatever we know about Tipu is based on his military achievements only. We often ignore his great administration. Here an attempt has been made to present a picture of his oft-neglected efficient rule.)

On the 4th of May 1799, the lion of Mysore and lover of liberty ceased to roar. Since his death his name has become the emblem of liberty. Tipu, a perfect ruler, was not only an ideal soldier but he also showed great qualities of an ideal administrator. Although his subjects had not been faithful to him, and he was always engaged in war and thus could not devote himself fully to civil government, yet he introduced many wise and beneficient reforms in every conceiveable branch of administration. He was not merely a military autocrat, drunk with the spirit of territorial aggrandizement, rather he was endowed with the spirit of an enlightened despot, which led him to apply all the powers of his active mind to the task of devising a system of government which was strong as well as beneficial.

The result of his reforms was that there was general peace and prosperity in the country and the state ran on the path of development. Mr. Moors who once visited his state observes thus "When a person travelling through a strange country finds it well-cultivated, populous with industrious inhabitants, cities newly founded, commerce extending, towns increasing and every thing flourishing so as to indicate happiness, he will naturally conclude it to be under a form of government congenial to the minds of people. This is the picture of Tipu's country and this is our conclusion respecting its government."

Central Administration :

Tipu was the head of the administration. He never represented himself as an absolute monarch rather he deemed himself as the trustee of the supreme

power of God. He extended his personal supervision over every branch of his administration and he often issued instructions to his officers. He had divided his central government into six departments which were named by Kuchchries These were (i) Mir Asaf (Finance & Revenue department) (ii) Muluk-ut-Tujjar (Trade, Commerce & Industry) (iii) Mir Khuzian Kuchchry (Treasury) (iv) Mir Yam Kuchchry (Marine Department) (v) Mir Sadur Kuchchry (The Ordnance) (vi) Mir Miran Kuchchry (Military Department).

Among these the most important department was Mir Asaf Kuchchry which was held by Mir Sadiq. Every department was managed by a separate Board consisting of five members : One Chairman, accountant one (Mustady) and one chief accountant (Sarishtadar). Besides these major departments other minor departments were (i) Amarat Mahal (Breeding of Animals Department) (ii) Public Building Department (iii) Posts Intelligence Department. Whereas the former two were managed by the ministers, the later was personally managed by Tipu. Surrangapatum, the capital, had separate administrarion of its own. Its chief heads were : Darogha, Qiladar, Kotwal and Qazi.

Provincial Administration :

On assuming power Tipu devided his kingdom into 7 provinces but he went on increasing their number. This process continued till 1794 when their total number reached thirty seven. The province was named as Asafi Turky. Each Asafi Turky was the highest administrative unit, next being the Amaldari Turky (District). Whereas the Asafi Turky was governed and administered by Asaf and Faujdar, the Amaldari Turky was under the control of Amil. Every district contained small villages administered by Shambhogs. Disputes were settled by the Maulvies & Pundats or Punchayat.

Revenue :

Land belonged to the tenant and his decendants so long as it was cultivated and rent was paid. He was free to give up land if he thought the cultivation not worth-while In that case he was not to pay the rent and the land would revert to the state. The rent was fixed according to the quality of the soil. He also took certain steps to abolish all the jagirs.

Agriculture :

Since the biggest industry of the state and the largest segment of the economy of the state was

agriculture so Tipu diverted his special attention towards the improvement of lands and agriculturists. As regards agriculturists they were on the verge of deterioration when Tipu took over the reins of Govt. Irrational customs were prevailing in the state. Due to the harsh attitude of the landlords the peasants were prone to get into debts not for improving their lands but to meet their personal expenditure on daily life.

Because of improvidence and extravagance of the peasants, lands reached finally into the hands of money-lenders (*Sahukars*). This led to the concentration of land-ownership into a few hands. To meet such adverse situation Tipu took two steps (i) To stop the peasants and the villagers from being spendthrift, he made it a rule that no one was allowed to spend more thon 1% of the annual income on festivals, religious or seasonal whatever (ii) Proprietary rights on favourable terms and conditions were given to poor tenants. He abolished all interme diaries and appointed his own officers to finance the tenants. Sometimes peasants were given *Taccavi* loans to relieve them of their distress. To meet the food problem created by wars, he encouraged produce of wheat, barley and sugercane. The cultivators of Baramahal were ordered to cultivate mulberry tree and breed silk-worms. The Amil was required to make tours in the areas under him and submit the report about the economic and material condition of the people.

Trade and Industry.

Tipu not only took steps to improve agricultural sector of economy but he also paid special attention towards the promotion of the industries at home, as well as abroad where the material concerned was available in abundance. Two factories at Cutch and Juddah were established. A big trade centre was established at Muscut. He initiated trade relations with China, and made a plan to establish 30 factories inside Mysore and 17 in China. A public Trading Company was also established. It had some features of the modern co-operative societies. The industrial position of the country was so strengthened that almost everything was produced and manufactured inside the country. These manfactured goods included paper, watches, scissors, cloth, yarn, guns cannons etc. Plants were installed at Bunglore to produce goods. In his reign a French Engineer invented a machine to bore cannons.

agriculture so Tipu diverted his special attention towards the improvement of lands and agriculturists. As regards agriculturists they were on the verge of deterioration when Tipu took over the reins of Govt. Irrational customs were prevailing in the state. Due to the harsh attitude of the landlords the peasants were prone to get into debts not for improving their lands but to meet their personal expenditure on daily life.

Because of improvidence and extravagance of the peasants, lands reached finally into the hands of money-lenders (*Sahukars*). This led to the concentration of land-ownership into a few hands. To meet such adverse situation Tipu took two steps (i) To stop the peasants and the villagers from being spendthrift, he made it a rule that no one was allowed to spend more thon 1% of the annual income on festivals, religious or seasonal whatever (ii) Proprietary rights on favourable terms and conditions were given to poor tenants. He abolished all interme diaries and appointed his own officers to finance the tenants. Sometimes peasants were given *Taccavi* loans to relieve them of their distress. To meet the food problem created by wars, he encouraged produce of wheat, barley and sugercane. The cultivators of Baramahal were ordered to cultivate mulberry tree and breed silk-worms. The Amil was required to make tours in the areas under him and submit the report about the economic and material condition of the people.

Trade and Industry.

Tipu not only took steps to improve agricultural sector of economy but he also paid special attention towards the promotion of the industries at home, as well as abroad where the material concerned was available in abundance. Two factories at Cutch and Juddah were established. A big trade centre was established at Muscut. He initiated trade relations with China, and made a plan to establish 30 factories inside Mysore and 17 in China. A public Trading Company was also established. It had some features of the modern co-operative societies. The industrial position of the country was so strengthened that almost everything was produced and manufactured inside the country. These manfactured goods included paper, watches, scissors, cloth, yarn, guns cannons etc. Plants were installed at Bunglore to produce goods. In his reign a French Engineer invented a machine to bore cannons.

Army & Forces :

His army was the best in the whole of India. He trained his forces on European methods. His army was divided into 3 parts (1) Regular horses (2) Irregular horses (3) Infantry. To meet the deficiency of warships in wars he established dockyards at Bunglore and Wajid Abad. He had strong naval army headed by Mir Yam and Mir Bahar.

All these measures clearly prove that Sultan Tipu was an ideal Muslim sovereign of India in the eighteenth century and he did his level best to establish an efficient rule which went a long way to ameliorate the condition of masses. Had he lived longer he would have done more than this. Nevertheless, it was his extraordinary capability as an administrator that his subjects became happy and prosperous during his short span of life.

Continued from page 9

will mininize the span of disappointment which may be caused by failure at the beginning of this practice.

The sentence is this:

"A man on my right said that it is right that a wright who is right and right has right to write about rites"

I wrote the sentence with my dictionary opened before me. So I will not mind if you, too, pick up yours to confirm for yourself.

Student Life

35 Years Ago

Some thirty-five years ago, one wintry morning in 1927, I remember the corridors of a huge building full of noise and activity, strange faces and colours. After filling up my admission form and carrying certificates I walked towards the Principal's room. Suddenly I was face to face with a stalwart *pathan* wearing fierce moustaches, dressed in green and red livery of golden borders all over, complete with a long dagger dangling by his side. A cold wave creeped down my vertebrae, but soon this tiger of a man bowed low and conducted me inside. Now I was standing at attention before Major Alexander wilson, M.A. (Oxon), the then Principal of Islamia College, Lahore. I, being a first divisioner—a rare distinction for Muslims in those days—was courteously received and admitted. The only advice I got from my benevolent Principal was to immediately equip myself with the college uniform and always look smart in immaculate dress. In the evening, I went out shopping and the first thing I purchased was an eight inches high crimson hard cap-called FEZ — plumed with a black tassel of 200 silken threads, carefully arranged and sewn on the edge in a manner that with a slight toss of the head they glistened and swayed from eye-brow to the nap of my neck. The college uniform was either a green blazer or a black Turkish coat buttoned upto the chin worn with white *shalwar* and black shoes. Generally, the youngmen of those days wore varied clothes, but certain articles which everybody loved to possess are now extinct and have totally disappeared. For example, a bright and deeply coloured butterfly-sort of bow fixed on a white glazed semi-stiff collar attracted attention. Some aristocrat dandies used tootle-ties with double knots in their starched semi-stiff collars which were held in position with an oblong metal-back button and collar-bones, and a shiny red glass-stone upper button, and finally a gold-enamelled screw-bar held the tie-knot at proper angle. A few elder students used high-plumed white turbans sitting on their heads like peacocks, but

still the tarboosh or Fez was popular among the Muslim youngmen. Then the hair style was long hair combed back smooth towards the neck without any artificial curl or partings. Most of the progressive few kept Ronald-colman style moustache half down shaven with pencilled off tips, and 3-inches long tress at temples, abruptly razored off at the ear-pads. Then a shalwar of five and a half yards of white starched long cloth (*latha*) needed many careful ceremonies. It had to be properly terraced and creased. The bottom end must be 26 inches broad and decorated with red or blue threads running over it in parallel lines. Then there were black patent-leather pair of shoes of broad toes or black calf leather shoes having knob-like toes, called Derby shoes. The broad bottoms of *shalwars* must cover the shoe-laces—only toes were visible. Most of the *shalwars* covered the heels as well as touched the ground while walking. The socks were long and held up with garters having many buckles, loops and even plumes.

Some other fashions and styles of clothes current in the late twenties will interest the young dandies of today. Even western-stung fellows who were known as "suited-booted" boys, had double-breasted waist-coats, fitted with innumerable shiny buttons under their short coats. Wearing pants without any coat was looked down upon. A special care was taken that shirts even when tucked up in the pants, should not be exhibited from behind. Similarly blazers and short-coats were long enough to cover the buttocks completely. It was considered indecent to wear only the pants. Nylons, decarons and plastics were, of course, quite unknown. The combs and brushes were made of buffalo horns, tortoise shell, or fish bones only. Fountain pens were considered a luxury. We had ingeniously wound-up paper pencils with a silvery cap on it, and a silken handkerchief with a green border artfully tucked up in our upper pockets or neatly wound round our necks. A teen-ager having pearly teeth would often get his front teeth bored by an expert and had two pure gold-nails driven and finally rivetted in them, so that whenever he smiled many hearts bled. Most of the students kept pocket-watches fixed with thin silver or gold chains. I had a pair of fine chain arched in either of my upper pockets. One of them held my suit-case keys and a silver tooth-pick and an ear-prick. Wrist watches were the envied property of the fair-sex exclusively. During winter multi-coloured mufflers were freely used

and displayed. Pull-overs, slip-overs, leather-jackets and bush-shirts were only heard of or seen in advertisement columns of English magazines. Another coveted possession were golden buttons bound with black-silk thread with matching tich-cuff-links, tucked in silken high-tailored chemise. There were many other articles used by the old student community which I can mention—but now after a decade when I see a handsome chap, wearing 16 bore narrow-bottomed pantie pasted tightly round his unshapely rumps, waddling and swaggering in corridors and verandas, my perturbed imagination finds repose in the lap of good old days when life was sober, modest and enjoyable.

APPOINTMENTS

The Principal has been pleased to make the following nominations for the term 1963-65.

1. President Students' Union : Dr. S.M. Shahid M.Sc. Ph.D. (London)
2. Secretary Staff Council : Ch. Hameedullah M.A.
3. Controller of Examinations : Khan Habibullah Khan M.Sc.
4. Registrar of Examinations : Mohammad Ibrahim Nasir M.A.
5. Incharge Almanar (Urdu Section) : M.A. Khalid M.A.
6. Incharge Almanar (English Section) : Ch. Hamid Ahmad M.A.

PRESIDENTS OF GAMES AND SPORTS.

1. Basketball — Ch. Mohammad Ali M.A.
   M. Aslam Qureshi M.Sc. (Jt. President)
2. Rowing — Ch. Hamid Ahmad M.A.
3. Cricket — Mirza Khurshid Ahmad M.A.
4. Volleyball — Ch. Ataullah M.A.
5. Kabaddi — Ch. Mohammad Sharif Khalid M.A., LL.B.
6. Hockey — Aftab Ahmad M. A.
7. Football — Ch. Aziz Ahmad Tahir M.A.
8. Badminton — Maqbool Ahmad M.Sc.

Sarfaraz Tariq B.A., Hons. Part III

PERSEVERANCE OF HAZRAT ABU BAKAR

Hazrat Abu Bakar had the privilege of entering the fold of Islam when the entire world was over-shadowed by the darkness of paganism and heresy. From now onward he showed such a devotion to the Holy Prophet as none could excel. He participated in all the battles fought against the enemies of Islam during the life of the Holy Prophet and did wonders in the battlefields. But it is for his role as the first Caliph of Islam that his name shall be remembered, chiefly for rendering meritorious services to the cause of Islam.

Hazrat Abu Bakar was valiant, courageous and steadfast even in the darkest hours. Just cast a glance over the hour when the Holy Prophet breathed his last. All eyes were wet with tears; there was panic and consternation prevailing among the Muslims; even an iron man like Hazrat Umar had been upset and was not prone to admit such a great loss—the death of his Holy Master with his sword in hand, Hazrat Umar threatened to sever the head of anybody who uttered a single word about the death of the Holy Prophet. In such disturbed circumstances, Hazrat Abu Bakar reached there and with great courage addressed the people thus:

> "Who-so-ever worshipped Muhammad, he should know that Muhammad is dead. And who,so-ever worshiped Allah should remember that Allah is living and shall never die".

Then he recited the following verses of the Holy Quran:

> "And Muhammad is only Messenger. Verily all Massengers have passed away before him. If then he die or be slain, will you turn back on your heels? And he who turns back on his heels shall not harm Allah at all. And Allah will certainly reward the grateful".

When the Muslims heard these verses all their previous doubts were removed and their hearts were satisfied with the decree of Allah the Great. It was due to Abu Bakar that Muslims were convinced of the perpetuation of the

Holy Prophet's mission.

Next came the question as to who should succeed the Holy Prophet (peace be upon him!) When Abu Bakar reached the hall of Banu Saida, the problem of succession was still a moot-point. There twas no unanimity of opinon The '*Ansars*' were bent upon electing their own Caliph apart from that of the *Muhajreen*. The Muslims stood on a perilous edge; the nation which was united and disciplined yesterday was looking scattered today; racial antagonism had come over the Muslims and there was every possibillity that the splendid edifice of Islam should fall to pieces. At this critical juncture, Abu Bakar stood up and in his short speech admitted the sacrifices of the *Ansars* but reminded them that the *Muhajreen* were in no way less than them because they had helped the Holy Prophet when the entire world was his enemy. Hence, he said, their rights could not be ignored. This so much impressed the audience that after a little hesitation, all of them concurred to elect one Caliph and Hazrat Abu Bakar was asked to take the oath of fealty which he did. Thus a a great crisis was averted by the steadfastness, political acumen and spiritual sagacity of Abu Bakar. But for him, the unity of Islam would have been shattered that very day.

Khilafat was not a bed of roses for Abu Bakar. Hearing the death of the Holy Prophet, many tribes rose in revolt and determined to invade the small state of Medina. Many of them refused to pay Zakat and encircled Medina. Had there been a weak man, he would have yielded to their pressure and allowed the non-payment of Zakat and thus impaired the fundamental teachings of Islam. But Abu Bakar wos not a man to be daunted. He said. "Even if ye withhold tithe of a camel I will fight you for it." Thus he upheld the cause of Islam and saved it from bad accretions.

The tribal disturbance was still in progress, when the question of sending an army of Muslims towards Syria came to the fore. The Holy Prophet had ordered the march of this army under the leadership of Usama. But now the the conditions were not favourable. The whole country was in the grip of serious disorders. But Abu Bakar was so brimful of conviction, that he resolved to send that army to Syria in obedience to the orders of the Holy Prophet. The people sent Hazrat Umar as their representative to Abu Bakar

so that he may prevent him from his programme When Abu Bakar heard this he replied :

> "Were the city swarming round with packs of ravening wolves and I left solitary and alone, the force should go, not a word from my master's lips shall fall to the ground."

Abu Bakar's prophscy was indeed true. Usama returned successfully from Syria. This greatly impressed the rebels who now realized that the Muslims were not so weak as they had took them.

The most difficult problem that remained to be solved was that of quelling the movement of apostacy. "As represented by Arab chroniclers", says Hitti, "all Arabia outside Al-Hijaz which is alleged to have accepted Islam and acknowledged the temporal of the Prophet, upon his death broke off from the newly organised state and followed a number of local and falseprophets." But Hazrat Abu Bakar did not lose his heart, rather he faced the situation courageously. He, without delay, sent disciplined forces of true Muslims under experienced generals and within a year, the whole Arabia was brought under the sway of Islam. In crushing this movement of apostacy, Abu Bakar showed great perseverance, enthusiasm and strategy. By his excellent courage and steadfastness, he re-established an organized state in Medina. If the iron determination and unparalysable faith of Hazrat Abu Bakar had not appeared, the unity of Islam would have suffered a serious set-back.

All these events clearly prove that Hazrat Abu Bakar possessed such an unconquerable spirit that nothing could deter him from following the path of righteousness.

Shahid Ahmad Khalon XII Class

ON TEDDYISM

An old proverb says "Nothing is good or bad but thinking makes it so". There are very few things, perhaps none, which have some evil in their very nature or the very existence of which is totally harmful and destructive ; yet people say 'teddyism' is an evil. There may be some truth in it, because so far as it is an 'ism' it's definitely a disease like other 'isms' and in that case it should be curbed. But let us analyse what it really implies.

Actually 'teddyism' is not associated with any particular dress to which the word is being loosely applied these days. Anybody who is uncivilized, rude, vulgar, and ignoble in behaviour is a teddy. The social parasites are teddies, whether they are clad in loose shirts or tight ones. The 'street haunters' and 'skirt chasers' are all teddies. So far as 'teddyism' means this, everyone will readily admit that this is a detestable social evil and should be reproached and vigorously checked.

Now let us come to the term as it is being commonly used these days. There is a section of youth in our society who wear a particular kind of tight dress and shoes with pointed toes, and indulge in anti-social and minoral activities. Personally, I believe, this disease, if disease it is, has been imported to our country through foreign films. Our boys go to pictures and are fascinated by 'yankees' and the sort of life they lead. Naturally, worldly allurement is hard to avoid, especially when one is adolescent and not properly taught in his religion and culture. Thus our boys start imitating what they see on the screen in the cinema, and as imitation is also natural, the fashion goes on spreading from cinema to streets, until it is being realized that it is not only a threat to our culture but a menace to social peace. They tease ladies, commit other crimes of the nature that are usually found in western countries.

Now there is nothing important in dress itself. Fashion is always changing ; perhaps quicker than a politician. If these teddies are in tight dress today they may be in loose dress tomorrow. They

will just follow the vogue of their profession. Islam has not prescribed any dress. Climate, social traditions and economic factors determine the dress of a place. Islam just advocates simplicity and sobriety in dress. Moreover dress should be made to hide the private physical beauty rather than projecting it as is done, in the so called 'teddy' dress.

The only malady with the teddy dress, in my opinion, is that it is not sober and it does not fulfil the real function of dress.

Thus teddyism is definitely an evil both directly and indirectly. Directly because the very dress is immodest and indirectly because it is an imitation of vankee film actors whose behaviour is also copied along with the dress. The remedy is quite simple and obvious. Islamic teaching should be imparted from the very childhood and Islamic cultural and social traditions should be cultivated among the youth. Proper respect and prestige should be inculcated for the Islamic values and national traditions. It is our inferiority complex that leads us to imitate the Westerners. If we establish our own Islamic standards and be proud of them, we will get rid of all these evils like teddyism etc.

Khalil-ur-Rahman XI Class

FORMALITIES

Formalities are usually attributed to outward appearance of form without much spirit and material sense in it, which gives us the impression that there is nothing worthwhile in them except affectation and show. But this is not true. They add to the grace and importance of the occasion. Most of the ceremonies would be dull if formalities were excluded from the programme. Consider the 'CONVOCATION', for instanee. What is its real and precise function ? Just distribution of degrees which can as well be done in the Principal's Office. But look at the graduates coming in the gowns and hoods, and the principal and the staff entering in a procession from the back door and the audience standing in respect ; and then the senior most member of the staff requesting the principal to declare the convocation open, and all that. What's the fun in these formalities. Compare it with boys simply receiving their degrees in the principal's office. What a trifle the occasion would appear to be! It will lose the whole charm and importance of the occasion. How bitterly do we realize the absence of formalities!

Apart from enhancing the grace and importance, formalities exhibit life and refinement in ceremonies Coronations of kings and queens are so colourful and impressive that spectators come from far and wide to witness them. The real function is only to crown the king which would have been quite simple and unimportant but for the seemingly superfluous formalities which lend sublimity and brightness to the occasion.

Some formalities are based on superstitions. The nailing of the Bride's door in Hindus originates from their belief that evil spirits and ghosts can cling to the young women and overpower them. So to keep them off they fix nails in the threshold of the bride's room.

Some formalities contribute to the development of mutual love and respect between persons. Take, for instance, the formalities between the teacher and the taught. A teacher is walking down the road, a student comes on bike and gets down near the teacher just as a

token of respect. The teacher gets pleased. Thus, though it is a mere etiquette and a formality without much material sense in it, but it does demonstrate a spirit of love and affection. It is an expression of what they feel at heart.

Too much familiarity and frankness breeds contempt. As long as people want to retain mutual respect and love, they must be, in a way and to a certain extent, formal in their dealings.

Formalities may have, and perhaps they do have, certain disadvantages, but of them I will write in some other issue. For the present let it be sufficient that formalities are a symbol of life, love and respect. They enhance the outward beauty, and grace of the occasion and hence need not be looked with disdain as they often are.